الرسالہ

Al-Risāla

June 2001 • No.•295 • Rs. 10

اندیشوں کے سلسلہ میں سب سے زیادہ یاد رکھنے کی بات
یہ ہے کہ بیشتر اندیشے کبھی واقعہ نہیں بنتے۔

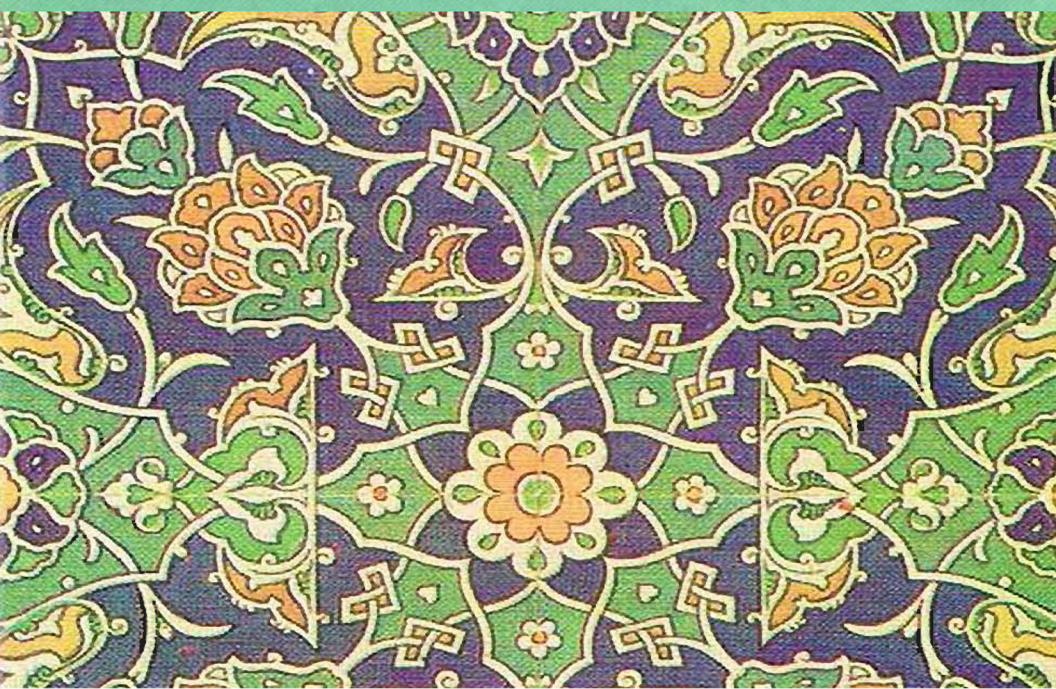

الرسالہ

Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel. 435 6666, 435 1128
Fax 435 7333, 435 7980
e-mail: skhan@vsnl.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES

Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY

IPCI: ISLAMIC VISION
434, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137 • Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY

AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
5801 SW 106th Ave,
Cooper City, FL 33328 U.S.A.
Tel. (954) 4348404 • Fax (954) 4342551
e-mail: kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana Road, Khureji Khas, Delhi- 110 051.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ، جون، 2001

فہرست

مایوسی نہیں 4
زندہ قلب 5
خیر امت 6
ایک اور عمل 7
تلاوتِ کلام 8
یک طرفہ سلوک 9
عالی ظرفی 10
پیغمبر اعظم 11
فرق کا مسئلہ 12
استحقاق جنت 13
آخری انجام 14
قناعت کامیابی کا راز 15
خشیت انسانی کے دور کا خاتمہ 21
اسلام کا طریقِ انقلاب 25
تفسیر بالرائے 31
ایک خط 40
ایک خط 44
خبر نامہ اسلامی مرکز 47

مایوسی نہیں

ایک نوجوان اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ میں دو مرتبہ لگاتار انجینئرنگ کا مپٹیشن میں بیٹھا مگر دونوں بار ناکام رہا۔ اس کے بعد مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ میں ہر وقت فکر مند رہنے لگا۔ یہاں تک کہ ذہنی طور پر بھی میں کمزور ہو گیا۔ پچھلے سال اتفاقاً الرسالہ (اردو) میری نظر سے گزرا۔ اس کے اندر مجھے نئی روشنی معلوم ہوئی۔ میں الرسالہ کا مستقل قاری بن گیا۔ خدا کے فضل سے اب میں اپنے اندر حوصلہ اور ہمت اور محنت کرنے کا جذبہ پا رہا ہوں (اشتیاق احمد)

زندگی میں ہر شخص کو ناکامی کے تجربات پیش آتے ہیں۔ عام طور پر لوگ اس قسم کے ناخوش گوار تجربات کو خارجی تعصب کے خانہ میں ڈال کر یہ سوچنے لگتے ہیں کہ موجودہ حالات میں میرے لئے آگے بڑھنے کا کوئی موقع نہیں۔ ترقی صرف کچھ خوش قسمت لوگوں کا مقدر ہے، وہ میرا مقدر نہیں۔

یہ سوچ سراسر غلط ہے۔ کوئی بھی خارجی سبب کبھی کسی آدمی کی ترقی میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ آدمی جب بھی ناکام ہوتا ہے یا اس کی ترقی رکتی ہے تو اس کا سبب خود اس کی اپنی ذات ہوتی ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ دوسروں کی شکایت کرنے کے بجائے خود اپنے آپ پر توجہ دے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ محنت کی کمی آدمی کو پیچھے ڈھکیل دیتی ہے۔ کبھی آدمی اپنی صلاحیت کے خلاف اپنے لئے غیر موزوں کام کا انتخاب کرتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ ایک بار کی کوشش کو آخری کوشش سمجھ لیتا ہے، حالانکہ حالات کا تقاضا ہوتا ہے کہ بار بار کوشش کی جائے۔

اس طرح کی مختلف داخلی کوتاہیاں آدمی کو ناکامی سے دوچار کرتی ہیں۔ مگر آدمی کو چاہئے کہ وہ ہر ناکامی کو وقتی سمجھے۔ وہ اس کو آخری واقعہ کے بجائے درمیانی واقعہ قرار دے۔ وہ اپنی ساری سوچ خود اپنی کوتاہی کو دریافت کرنے میں لگا دے۔ اپنی کوتاہی سے بے خبری آدمی کو پست کر کے چھوڑ دیتی ہے۔ اور اپنی کوتاہی سے باخبری عمل کا جذبہ ابھار کر آدمی کو کامیابی کی منزل پر پہنچا دیتی ہے۔

زندہ قلب

عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ انہ قال: أُطلُب قَلْبَكَ فی ثَلاثَة مَواطِنَ. عند سماع القرآن وفی مجالس الذِّکرِ و فی اوقات الخلوة. فَان لَم تَجِدْهُ فی هٰذه المَواطِنَ فَسَلِ اللہ أن یَمُنَّ علیك بقلبٍ فإنَهُ لا قَلْبَ لَكَ.

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ تم تین مواقع پر اپنے دل کو تلاش کرو۔ قرآن سننے کے وقت اور خدا کے ذکر کی مجلسوں میں اور تنہائی کے وقتوں میں۔ اگر ان مواقع پر تم اپنے دل کو نہ پاؤ تو اللہ سے درخواست کرو کہ وہ تم کو ایک دل دے دے۔ کیوں کہ تمہارے پاس دل موجود نہیں۔

دل آدمی کے جسم میں کیفیت کا سرچشمہ ہے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول بتاتا ہے کہ ایک مومن سے مختلف احوال میں جو قلبی کیفیات مطلوب ہیں، وہ کیا ہیں۔ مثلاً قرآن سننے کے وقت، خدا کی یاد کی مجلسوں میں اور اسی طرح تنہائی کے لمحات میں، یہ تین مواقع وہ ہیں جب کہ دینی اور ربانی کیفیات خصوصی طور پر آدمی کے اندر جاگتی ہیں۔ ان مواقع پر غافل آدمی بھی چونک پڑتا ہے۔ سویا ہوا آدمی بھی جاگ اٹھتا ہے۔ وہ فطرت کی گہرائیوں میں اتر کر سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آدمی کا دل اگر زندہ ہو تو اس کا حال یہ ہو گا کہ جب اس کے سامنے قرآن پڑھا جائے گا تو اس سے اس کو ربانی غذا ملنے لگے گی۔ جب اس کو خدا کی یاد دلائی جائے گی تو اپنے خالق و مالک کے بارہ میں اس کے اندرونی احساسات جاگ اٹھیں گے۔ جب وہ تنہائی میں ہو گا تو اس کے اندر احتساب خویش کی کیفیت ابھر آئے گی۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے سامنے کھڑا ہوا پائے گا۔

اگر کسی آدمی کا حال یہ ہو گا کہ یہ خصوصی مواقع بھی اس کی روح میں ہلچل پیدا نہ کریں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کے اندر کی کھیتی ویران ہو گئی ہے۔ اس کے اندر فطرت ربانی کے سوتے خشک ہو گئے ہیں۔ جو شخص اپنے آپ کو اس حال میں پائے، اس کو چاہئے کہ وہ اللہ سے اپنے لئے ایک زندہ قلب اور کیفیت سے بھری ہوئی روح کا طالب بنے۔ کیوں کہ اس کے بغیر انسان کی کوئی قیمت نہیں۔ اس کے بغیر کسی انسان پر سعادتوں کا دروازہ کھلنے والا نہیں۔

خیر امت

"تم خیر امت ہو" اور "ہم خیر امت ہیں" ان دونوں فقروں میں بظاہر معمولی لفظی فرق ہے۔ مگر پہلا فقرہ قرآن میں موجود ہے، جب کہ دوسرا فقرہ قرآن یا حدیث میں موجود نہیں۔ قرآن و سنت اور آثار صحابہ کا پورا ذخیرہ دوسرے فقرے سے یکسر طور پر خالی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تو صحابہ کرام کے بارے میں فرمایا کہ "تم خیر امت ہو" مگر کسی بھی صحابی کی زبان سے کبھی یہ الفاظ نہیں نکلے کہ "ہم خیر امت ہیں"۔

یہ فرق بتاتا ہے کہ دونوں جملوں میں اگرچہ بظاہر صرف معمولی لفظی فرق ہے، مگر حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ ایک مکمل طور پر صحیح ہے اور دوسرا مکمل طور پر غلط۔ اگر دونوں جملوں میں یہ فرق نہ ہوتا تو جس طرح پہلا فقرہ قرآن میں موجود ہے، اسی طرح دوسرا جملہ بھی اصحاب رسول کی زبان سے ضرور ادا کیا جاتا۔

اصل یہ ہے کہ "خیر امت" اللہ تعالیٰ کا ایک فیصلہ ہے نہ کہ مسلمانوں کا گروہی لقب۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے جب اپنے سالہا سال کے عمل کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا کہ وہ فی الواقع ان اوصاف کے حامل ہیں جو اللہ کی نظر میں اوصاف خیر کی حیثیت رکھتے ہیں، اس وقت اللہ تعالیٰ نے بطور اظہار واقعہ یہ ارشاد فرمایا کہ اے اصحاب رسول اب تم خیر امت کے درجہ کو پہنچ چکے ہو۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس سے کنتم خیر امة کی یہ تفسیر منقول ہے کہ اس سے مراد اصحاب رسول ہیں (بقیہ لوگ اپنے عمل کے اعتبار سے عند اللہ اس میں شامل قرار پائیں گے)۔

اس معاملہ کو ایک اور مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ قرآن میں صحابہ کرام کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا (رضی اللہ عنهم) مگر کسی بھی صحابی کے بارے میں یہ ثابت نہیں کہ اس نے اپنی زبان سے یہ کہا ہو کہ ہم وہ لوگ ہیں جن سے اللہ راضی ہے۔ یہ اللہ کے فیصلہ کا معاملہ ہے نہ کہ صحابہ کے اپنے دعویٰ کا معاملہ۔ اسی طرح خیر امت بھی خدا کا ایک فیصلہ ہے، اس کو اپنی طرف سے بطور دعویٰ بیان کرنا درست نہیں۔

ایک اور عمل

علیہ بن زید ایک غریب صحابی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک کا ارادہ فرمایا تو لوگوں سے تیاری کے لئے کہا۔ علیہ بن زید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ میرے لئے سواری کا انتظام کر دیں تاکہ میں بھی اس مہم میں شرکت کر سکوں۔ آپ نے فرمایا کہ میرے پاس مزید سواری یا مال نہیں ہے جس سے میں تمہاری مدد کروں۔

علیہ بن زید اپنے گھر کی طرف لوٹے تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ان کا دل اس احساس سے بے قرار تھا کہ کاش میرے پاس سواری اور زادِ راہ ہوتا تو میں بھی اس اسلامی عمل میں شرکت کرتا۔ اس دن وہ ساری رات نماز پڑھتے رہے اور روتے رہے۔ اس وقت ان کی زبان سے یہ دعا نکلی: اے اللہ تو نے جہاد کا حکم دیا ہے۔ مگر تو نے مجھے وہ سامان نہیں دیا جس کے ذریعہ میں جہاد میں شرکت کر سکوں۔ میں صدقہ جہاد پر قادر نہیں۔ اب جس مسلمان نے بھی مال یا جسم یا آبرو کے مقابلہ میں مجھ پر کوئی زیادتی کی ہو تو میں اس کو اسی مسلمان کے اوپر صدقہ کرتا ہوں۔

ایک اور حدیث (التفسیر المظہری ۴/۲۸۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ صحابی کے جذبہ کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا اور بقیہ صحابہ کے ساتھ شریک جہاد نہ ہونے کے باوجود وہ جہاد کے انعام کے مستحق قرار پائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مومن اگر معذوری کے سبب سے عملاً کسی کارِ خیر میں شریک نہ ہو سکے تو اس کے بعد بھی اس کے لیے شرکت کا موقع ہے اور وہ یہ کہ اپنی روح کی تڑپ اور اپنے دل کی کیفیات کے ساتھ وہ اس میں شریک ہو جائے، وہ دعاؤں اور آنسوؤں کے ساتھ ان کا ہم سفر بن جائے جن کا ہم سفر وہ سواریوں کی صورت میں نہ ہو سکا تھا۔ جو صاحب ایمان ایسا کر سکے اس کے لیے خدا کے یہاں وہی ثواب ہے جو عملی طور پر شریک ہونے والوں کا ہے۔

خارجی عمل جس طرح اہم ہے اسی طرح داخلی عمل بھی اہم ہے۔ بلکہ بعض اوقات داخلی عمل خارجی عمل سے بھی زیادہ عظیم ہو جاتا ہے۔

تلاوت قرآن

قرآن کی تلاوت وہ چیز ہے جس کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ ایمان والے وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل جائیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کے سامنے پڑھی جائیں تو وہ ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں (الانفال ۲) دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اتارا گیا ہے تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ اس سبب سے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب، ہم ایمان لائے۔ پس تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ لے (المائدہ ۸۳۔۸۴)

قرآن براہ راست خدا کا کلام ہے۔ اس میں خداوندی جلال کی گرج ہے۔ اس میں عبدیت کے احساس کو جگانے والی بجلیاں ہیں۔ اس میں وہ نور ربانی ہے جو کسی کے اندر اترے تو اس کے پورے داخلی وجود کو روشن کر دے۔ اس میں وہ شعلۂ حق ہے جو کسی قلب پر اترے تو وہ اس کو کوہ طور کی طرح ریزہ ریزہ کر دے۔ ایسے کلام کی تلاوت سادہ طور پر تکرار الفاظ کا نام نہیں ہوتی۔ وہ دل و دماغ میں آگ لگانے کے ہم معنی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کا بار بار پڑھنا شخصیت انسانی میں ایک انقلاب پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔

قرآن کی تلاوت سادہ طور پر ایک کتاب کی تلاوت نہیں ہے۔ یہ کلام الٰہی کا مطالعہ ہے۔ یہ گویا بالواسطہ انداز میں خدا سے ہم کلام ہونا ہے۔ ایسی حالت میں تلاوت قرآن کے دوران اس کے مطابق کیفیات کا ظہور ہونا چاہئے۔ اگر اس غیر معمولی کلام سے مطابقت رکھنے والی کیفیات آدمی کے اندر پیدا نہ ہوں تو سمجھا جائے گا کہ وہ غفلت میں مبتلا ہے، اس نے زندہ شعور کے ساتھ قرآن کو نہیں پڑھا۔

قرآن کو پڑھتے ہوئے ایسا ہونا چاہئے کہ آدمی کے اوپر خدا کی ہیبت طاری ہو۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے قریب محسوس کرنے لگے۔ قرآن کا پڑھنا اس کو خدا سے ملانے والا بن جائے۔ قرآن کو پڑھنا اس کے لیے خدا سے زندہ تعارف کے ہم معنی ہو۔ قرآن میں وہ ایک طرف اپنی عبدیت کو پالے اور دوسری طرف خدا کی معبودیت اور اس کے جلال کو۔

یک طرفہ سلوک

قرآن میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اجتماعی معاملات میں یکطرفہ حسن سلوک کا انداز اختیار کیا جائے۔ اگر کوئی شخص اشتعال انگیز باتیں کرے۔ یا وہ برائی کے ساتھ پیش آئے تب بھی اس کے مقابلہ میں منفی رد عمل کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے، بلکہ برائی کے جواب میں بھلائی کی جائے۔ برائی کے جواب میں بُرائی کرنے سے پرہیز کیا جائے۔

اس قسم کا اعلیٰ سلوک اپنے اندر تسخیری طاقت رکھتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس قسم کا سلوک کرے تو قرآن کے الفاظ میں اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسے کوئی دوست قرابت والا (حم السجدہ ۳۴)۔ اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ دو فرد یا گروہ کے درمیان اختلاف پیدا ہو جاتا ہے، ایک کی اشتعال انگیز بات دوسرے کو بھڑکا دیتی ہے۔ ایک کی طرف سے برائی کا سلوک دوسرے کے اندر انتقام کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ وقتی طور پر ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے دونوں ایک دوسرے کے حریف اور دشمن ہیں۔

اصل یہ ہے کہ ہر آدمی کے اندر پیدائشی طور پر دو مختلف اور متضاد صلاحیتیں ہیں۔ ایک وہ جس کو قرآن میں 'نفس امارہ' کہا گیا ہے۔ اور دوسرا وہ جس کے لیے قرآن میں 'نفس لوامہ' کا لفظ آیا ہے۔ یہ دونوں صلاحیتیں ابتدائی طور پر سوئی ہوئی ہوتی ہیں۔ البتہ وہ اس وقت جاگ پڑتی ہیں جب کہ انھیں باہر سے کوئی ٹھیس پہنچائی جائے۔

آپ کا اختلاف کسی سے ہو جائے یا کسی وجہ سے ایک شخص آپ کو اپنا دشمن دکھائی دینے لگے تو ظاہر حالات کی بنیاد پر فیصلہ نہ کیجئے۔ ایسا جب بھی ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کسی وجہ سے اس آدمی کا نفس امارہ بھڑک اٹھتا ہے۔ اب اگر آپ اس کے جواب میں نرمی کا انداز اختیار کر کے اس کے بھڑکے ہوئے نفس امارہ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کریں۔ اور اس کے دشمنانہ سلوک سے بُرا اثر نہ لیتے ہوئے اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں تو اس کے نتیجہ میں اس کا ضمیر جاگ اٹھے گا۔ اگر آپ ایسا کریں تو وہی معجزہ پیش آئے گا جو قرآن میں مذکور ہے۔ یعنی وہ شخص جو آپ کا دشمن دکھائی دے رہا تھا وہ آپ کا دوست بن جائے گا۔

عالی ظرفی

دور عباسی کا ایک واقعہ تاریخ کی بعض کتابوں میں ان الفاظ میں آیا ہے:

خطب الخليفة العباسي المنصور يوماً في جماعة من الاعراب بالشام، فقال: ايها الناس ينبغي ان تحمدوا الله على ما وهبكم فيّ. فاني منذ وليتكم ابعد الله عنكم الطاعون الذي كان يفتك بكم. فقال له احد المستمعين ان الله اكرم من ان يجمع علينا في وقت واحد الطاعون والمنصور۔

(خلیفہ منصور عباسی نے ایک روز شام کے اعراب کی ایک جماعت کے سامنے تقریر کی۔ اس نے کہا کہ اے لوگو، تم کو چاہئے کہ تم میرے جیسے خلیفہ کے ملنے پر اللہ کا شکر ادا کرو۔ کیوں کہ جب سے میں خلیفہ ہوا ہوں اللہ نے تم سے طاعون کو دور کر دیا ہے۔ اس کے بعد سننے والوں میں سے ایک شخص نے کہا کہ اللہ اس سے زیادہ کریم ہے کہ وہ ایک وقت میں ہمارے اوپر طاعون اور منصور دونوں کو جمع کر دے)۔

اعرابی کا یہ جملہ سخت توہین آمیز تھا۔ عام طریقہ کے مطابق چاہئے تھا کہ خلیفہ منصور عباسی اس کو سن کر بھڑک اٹھے اور مذکورہ شخص کے قتل کا حکم دے دے۔ مگر خلیفہ منصور نہایت بلند حوصلہ آدمی تھا۔ اس نے اس کی قدر کی اور حکم دیا کہ اس شخص کو خزانۂ خاص سے انعام دیا جائے اور اس کو عزت کے ساتھ اس کے گھر پہنچایا جائے۔

پست اور کمینہ قسم کے لوگ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کہنے والے نے ان کی موافقت میں بات کہی ہے یا ان کی مخالفت میں۔ وہ موافق کو نوازتے ہیں اور مخالف کے دشمن بن جاتے ہیں۔ مگر بلند حوصلہ اور عالی ظرف لوگ موافقت اور مخالفت سے اوپر اٹھ کر سوچتے ہیں۔ وہ اصل بات کو دیکھتے ہیں نہ یہ کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ ان کے موافق ہے یا ان کے خلاف۔

اسی کا نام عالی ظرفی ہے۔ یہ عالی ظرفی آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ اعلیٰ صلاحیت کے افراد کو اپنے گرد اکٹھا کر سکے۔ اس کے برعکس جس آدمی کے اندر عالی ظرفی کی یہ صفت نہ پائی جائے۔ اس کو اس کی قیمت اس شکل میں دینی پڑے گی کہ بے صلاحیت افراد کے سوا اس کو کسی اور کی ہم نشینی حاصل نہ ہو۔

پیغمبر اعظم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نبوت کے ابتدائی سال تک مکہ میں تھے۔ یہاں کچھ لوگوں نے آپ کا ساتھ دیا۔ لیکن وہاں کی اکثریت آپ کی مخالف بنی رہی۔ یہ لوگ آپ کے خلاف مسلسل سب وشتم کرتے تھے۔ مگر آپ نے ہمیشہ اس کے مقابلہ میں مثبت رد عمل کا ثبوت دیا۔ مکہ کی ایک شاعر خاتون نے آپ کے خلاف نظم لکھی جس میں آپ کو مذمم (مذمت کیا ہوا) کہا گیا تھا۔ آپ نے اس کا جو جواب دیا اس کا مطلب یہ تھا کہ اس عورت کو دیکھو یہ مجھ کو مذمم کہہ رہی ہے اور خدا نے تاریخ میں میرا نام محمد لکھ دیا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن کے مطابق، خُلق عظیم پر تھے۔ یعنی آپ اعلیٰ اخلاقی کردار کے حامل تھے۔ آپ ہمیشہ لوگوں کے ساتھ برتر سلوک والا معاملہ کرتے تھے۔ آپ تاریخ کے عظیم ترین انسان تھے اس لئے آپ کا کردار بھی عظیم ترین کردار تھا۔

واقعات بتاتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کو سخت ترین مخالفت کا سامنا پیش آیا آپ کی زندگی میں بھی مکہ اور مدینہ کے لوگوں نے آپ کے خلاف اشتعال انگیز باتیں کیں۔ اور بعد کے زمانہ میں بھی آپ کو بدنام کرنے کے لئے ہر قسم کی کوششیں کی جاتی رہیں۔ خاص طور پر صلیبی جنگوں کے بعد بہت بڑے پیمانہ پر مخالفانہ مہم چلائی گئی مگر آپ کے خلاف بولے ہوئے تمام الفاظ فضا میں گم ہو گئے۔ ہر آنے والے دور میں آپ کی شخصیت مزید اضافہ کے ساتھ نمایاں ہوتی رہی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اس سے بہت زیادہ بلند ہے کہ کسی انسان کے قلم کی سیاہی اس کو داغدار کر سکے۔ ساری تاریخ، تمام انسانی علوم، حتی کہ پوری کائنات ایسی ہر کوشش کی تردید ہے۔ جس ہستی کے ظہور نے خود انسانی تاریخ کو بدل ڈالا ہو، اس کے فضل و کمال پر پردہ ڈالنا کسی بھی شخص یا گروہ کے لئے ممکن نہیں۔

فرق کا مسئلہ

ایک چیز اور دوسری چیز میں فرق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے قانونی تفریق اور دوسری ہے فطری تقسیم۔ قانونی تفریق انسان وضع کرتا ہے۔ اس لئے اس کو بدلنا ممکن ہے۔ لیکن فطری تقسیم خود خالق کائنات کی طرف سے قائم کی گئی ہے۔ اس کو بدلنے کی کوشش کرنا حقیقت واقعہ سے لڑنا ہے۔ اور حقیقت واقعہ سے لڑ کر کبھی کوئی شخص کامیاب نہیں ہو سکتا۔

مثال کے طور پر کسی ملک میں اگر یہ قانون بنا دیا جائے کہ ٹرین کے فرسٹ کلاس میں صرف سفید فام لوگ سفر کر سکتے ہیں، اور جو لوگ سیاہ فام ہیں وہ صرف سیکنڈ کلاس کی بوگی میں سفر کریں۔ انسانی ضمیر کبھی اس کو قبول نہیں کرے گا۔ ایسے قانون کے معاملہ میں درست بات یہ ہو گی کہ ہمیشہ کے لئے اس کا خاتمہ کر دیا جائے۔

مگر عورت اور مرد کے درمیان فرق کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ یہ سادہ طور پر ایسا نہیں ہے کہ جس طرح اونچی ذات کے لوگوں نے اپنے اور نیچی ذات کے درمیان امتیازی قوانین بنا ڈالے اسی طرح مردوں نے بھی عورتوں کے خلاف امتیازی قانون بنا رکھے ہیں۔ اور اس بنا پر عورت اور مرد زندگی کے میدان میں دوش بدوش نہیں چل رہے ہیں۔ بلکہ یہ معاملہ فطری تقسیم کا معاملہ ہے۔ یہ خود خالق فطرت ہے جس نے عورت اور مرد کے درمیان فرق قائم کیا ہے۔ نہ کہ کسی انسان نے۔

اصل یہ ہے کہ انسانی زندگی میں مختلف قسم کے کام ہوتے ہیں۔ مختلف قسم کے کاموں کی درست ادائیگی سے ایک اچھا سماج بنتا ہے۔ اس معاملہ میں فطرت نے یہ کیا ہے کہ اس نے تقسیم کار کے اصول پر کچھ کام مردوں کے لئے خاص کر دئے ہیں۔ اور کچھ کام عورتوں کے لئے۔ مثلاً سخت کام مردوں کے لئے اور ہلکے کام عورتوں کے لئے۔ یا سماج کے خارجی امور کو بنیادی طور پر مردوں سے متعلق کر دیا گیا اور داخلی امور کو بنیادی طور پر عورتوں سے۔ عورت اور مرد کا تخلیقی نقشہ اسی تقسیم کار کے اصول پر بنایا گیا ہے۔ اس تقسیم کار کو بدلنے کے لئے ہمیں خود تخلیقی نقشہ کو بدلنا پڑے گا۔ ہم تخلیقی نقشہ کو بدل نہیں سکتے اس لئے واحد عملی طریقہ یہ ہے کہ تقسیم کار کے اس اصول کو مان لیا جائے۔

استحقاق جنت

ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ پیر اور جمعرات کے دن جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔ پھر ہر اس بندے کو بخش دیا جاتا ہے جو اللہ کے ساتھ شرک نہیں کرتا۔ سوائے اس شخص کے جس کے اور اس کے بھائی کے درمیان کینہ ہو۔ پس کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کے معاملے کو مؤخر کرو یہاں تک کہ وہ دونوں اپنے باہمی معاملہ کو درست کر لیں۔ (ارکُوا ھذین حتیٰ یصطلحا) کتاب البر والصلۃ والآداب، صحیح مسلم بشرح النووی ۱۶/ ۱۲۲۔

اس حدیث میں جس بات کی نشاندہی کی گئی ہے اس سے مراد وقت نہیں ہے بلکہ نفسیات ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ فلاں وقت تک آدمی کے بارے میں جنت کا فیصلہ نہیں کیا جاتا۔ اور اس کے بعد جب فلاں وقت آجاتا ہے تو اس کے لیے جنت کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے بلکہ اس سے مراد خود اس کی داخلی نفسیات ہے۔ جو دراصل اس کے لیے جنت کا استحقاق پیدا کرتی ہے۔

ایک آدمی کا حال اگر یہ ہے کہ وہ اپنے بھائی کی طرف سے پیش آنے والے کسی ناپسندیدہ تجربے کے بعد اس سے متنفر ہو گیا۔ اور اس کے خلاف کینہ اور نفرت کے جذبات اس کے دل میں بھڑک اٹھے تو یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ ایسی نفسیات کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس کی روحانیت جاتی رہے گی۔ اس کا دماغ منفی خیالات کا کارخانہ بن جائے گا۔ وہ اپنی منفی سوچ کی بنا پر اس قابل نہ رہے گا کہ خدا کا فیض اس کے اوپر اترے اور اس کی زبان سے وہ پاکیزہ دعائیں نکلیں جو کسی آدمی کو جنت کا مستحق بناتی ہیں۔

اس کے برعکس جب ایسا ہو کہ ایک آدمی کا وقتی طور پر کسی سے بگاڑ ہو جائے مگر جلد ہی وہ اس سے توبہ کرے۔ وہ نفرت کے جذبات کو اپنے اندر سے نکالے اور اس کے بجائے محبت کے جذبہ سے دوبارہ مذکورہ شخص سے اپنے تعلقات کو درست کرے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کو فرشتوں کی ہم نشینی حاصل ہو جائے گی۔ خدا کی یاد کا نورانی چشمہ اس کے سینے میں جاری ہو جائے گا۔ اس کی زبان سے دعا کے وہ ربانی کلمات نکلنے لگیں گے جو سیدھے خدا تک پہنچتے ہیں اور آدمی کو جنت کا مستحق بنا دیتے ہیں۔

آخری انجام

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ـــــ اور جس دن انکار کرنے والے آگ کے سامنے لائے جائیں گے، تم اپنی اچھی چیزیں دنیا کی زندگی میں لے چکے اور ان کو برت چکے تو آج تم کو ذلت کی سزا دی جائے گی، اس وجہ سے کہ تم دنیا میں ناحق تکبر کرتے تھے اور اسی وجہ سے تم نافرمانی کرتے تھے۔ (الاحقاف ۲۰)

اس آیت میں کفر سے مراد حق کا انکار کرنا ہے۔ اس میں جس کردار کا ذکر ہے وہ دراصل وہ انسان ہے جس کے سامنے حق کھلے دلائل کے ساتھ آیا مگر اس نے ذاتی مصلحتوں کی بنا پر اس کو نہیں مانا۔ وہ ایک ایسی حقیقت کا منکر بن گیا جس کا برسر حق ہونا اس کے سامنے واضح ہو چکا تھا۔

اس کردار سے مراد دراصل کسی سماج کے وہ خواص ہیں جو کسی سے اپنے ماحول میں ممتاز درجہ حاصل کئے ہوئے ہوں۔ مثلاً کوئی کسی قدیم گدی پر بیٹھ کر بڑا بنا ہوا ہو۔ کوئی تحفظ قوم کے نام پر قیادت حاصل کئے ہوئے ہو۔ کوئی کسی عوامی کارگزاری کو دکھا کر لوگوں کی نظر میں اونچا بن گیا ہو، وغیرہ۔ ایسے لوگوں کے سامنے جب خالص حق کی آواز بلند ہوتی ہے تو ایک طرف وہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ آواز بلاشبہہ صداقت کی آواز ہے۔ مگر دوسری طرف شعوری یا غیر شعوری طور پر انھیں یہ اندیشہ رہتا ہے کہ اگر وہ اس حق کا کھلا اعتراف کریں تو وہ ان کے لئے اپنی حاصل شدہ حیثیت کی نفی کے ہم معنی بن جائے گا۔ یہ احساس ان کے اوپر اتنا زیادہ غالب آتا ہے کہ وہ حق کو حق سمجھتے ہوئے اس کا انکار کر دیتے ہیں۔

یہی وہ لوگ ہیں جن کا قرآن کی مذکورہ آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ آخرت میں ان کی شخصیت کے اس پہلو کو کھول دیا جائے گا۔ ان سے کہا جائے گا کہ دنیا میں جب تم نے حق کا اعتراف نہیں کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ تم چاہتے تھے کہ اپنے ملے ہوئے دنیوی فائدوں کو باقی رکھو۔ تم نے دنیا کے فائدے کی خاطر آخرت کے فائدوں کو نظرانداز کیا۔ پھر جب تم اپنا فائدہ دنیا میں لے چکے تو آخرت کی نعمتوں میں تمہارے لئے کوئی حصہ نہیں۔ یہاں تمہارے لئے صرف محرومی ہے اور ابدی عذاب۔

قناعت کامیابی کا راز

ایک عوامی مثل ہے۔ یہ مثل زندگی کی ایک اہم حقیقت کو بتاتی ہے اس مثل کے الفاظ یہ ہیں "آدھی چھوڑ کے پوری دھاوے، پوری ملے نہ آدھی پاوے"۔

اصل یہ ہے کہ انسان بیشتر حالات میں اپنی خواہشات اور اپنی امنگوں (ambitions) کے تحت سوچتا ہے اس بنا پر اکثر وہ ایسے اقدامات کر بیٹھتا ہے جو حقیقی حالات کے اعتبار سے اس کے لئے قابلِ حصول نہیں ہوتے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا عمل انجام کے اعتبار سے مکمل ناکامی پر ختم ہوتا ہے، وہ ناممکن کو حاصل کرنے کی کوشش میں ممکن کو بھی کھو بیٹھتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اکثر مشہور مسلم رہنماؤں کی کہانی یہی ہے۔ انہوں نے حقائق کی رعایت کئے بغیر محض اپنی خواہشوں اور امنگوں کے تحت بڑی بڑی چھلانگ لگادی، اس کا نتیجہ ملت کے حصہ میں تباہی کے سوا کچھ اور نہ آیا۔ اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے چند مثالیں لیجئے۔

۱۔ سردار شوکت حیات خاں مشہور پاکستانی لیڈر ہیں۔ وہ متحدہ پنجاب کے سابق وزیر اعظم مرحوم سر سکندر حیات خان کے صاحبزادے ہیں۔ سردار شوکت حیات خان نے اپنے کیریر کا آغاز دوسری جنگ عظیم میں فوجی افسر کی حیثیت سے کیا۔ ۱۹۴۳ میں مسلم لیگ کی سیاست میں سرگرم طور پر شامل ہوگئے۔ پاکستان کے قیام کے بعد وہ پنجاب کے وزیر بنے اور وہاں کے دوسرے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔

سردار شوکت حیات خاں نے اپنی زندگی کے حالات پر ایک کتاب انگریزی زبان میں لکھی ہے جس کا نام (دی نیشن دیٹ لوسٹ اٹس سول (The Nation that lost its soul) ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ (گم گشتہ قوم) دسمبر ۱۹۹۵ء میں پاکستان سے چھپا ہے۔ کتاب کا یہ اردو ایڈیشن ۴۶۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے ناشر جنگ پبلشرز لاہور ہیں۔ اس کتاب کے ایک باب کا عنوان "لیاقت علی خاں" ہے۔ جو پاکستان کے پہلے وزیر اعظم تھے۔ اس باب میں

مختلف باتیں کہی گئی ہیں ان میں سے ایک کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"نواب زادہ لیاقت علی خان" کو حقائق اور ملک کے جغرافیہ سے بھرپور واقفیت نہ تھی۔ جس کے وہ پہلے وزیر اعظم بن چکے تھے۔ ..... بعد میں کشمیر پر حملہ کے دوران جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن لاہور آیا۔ ایک ڈنر، جس میں لیاقت، گورنر مودی اور پنجاب کے چار وزیر موجود تھے، لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے سردار پٹیل کا پیغام پہنچایا۔ پٹیل جو ہندستان کی ایک طاقتور شخصیت تھا۔ اس کا پیغام تھا کہ اس اصول کی پابندی کی جائے جو کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین ریاستوں کے مستقبل کے بارے میں طے پایا تھا وہ یہ کہ ریاست اپنے باشندوں کی اکثریت اور سرحدوں کے ساتھ ملاپ کی بنا پر پاکستان یا ہندستان کے ساتھ الحاق کریں گی۔ پٹیل نے کہا کہ پاکستان کشمیر کو لے لے اور حیدر آباد دکن کا مطالبہ چھوڑ دے جہاں پر ہندو آبادی کی اکثریت تھی اور جس کا پاکستان کے ساتھ زمینی یا سمندری ذریعہ سے کوئی اتصال بھی نہ تھا۔ یہ پیغام دینے کے بعد ماؤنٹ بیٹن گورنمنٹ ہاؤس میں آرام کرنے چلا گیا۔

میں کشمیر آپریشن کا مکمل نگراں تھا۔ میں نے لیاقت علی خاں کے پاس جا کر انہیں تجویز دی کہ ہندستان کی فوج جو کشمیر میں داخل ہو چکی ہے ہم قبائلیوں کی مدد سے اس کو باہر نکالنے اور کشمیر کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ یہاں تک کہ ہماری اس وقت کی فوج بھی اس کامیابی کے حصول میں شاید مددگار ثابت نہ ہو سکے گی۔ لہذا ہمیں سردار پٹیل کی پیشکش کو ٹھکرانا نہیں چاہیئے۔ نواب زادہ نے میری جانب مڑ کر کہا "سردار صاحب، کیا میں پاگل ہو گیا ہوں کہ میں کشمیر کے پہاڑوں اور ٹیلوں کے بدلے ریاست حیدر آباد دکن کو چھوڑ دوں جو پنجاب سے بھی بڑی ریاست ہے"

پرائم منسٹر کے اس رد عمل کو دیکھ کر میں تو سن ہو گیا کہ ہمارا وزیر اعظم ملکی جغرافیہ سے اتنا بے خبر تھا۔ اس کی ذہانت کا یہ معیار کہ وہ حیدر آباد دکن کو کشمیر پر ترجیح دے رہا ہے۔ یہ تو احمقوں کی جنت میں رہنے والی بات تھی۔ حیدر آباد کا حصول ایک سراب تھا جب کہ کشمیر اپنے

آپ مل رہا تھا۔ کشمیر کی پاکستان کے ساتھ اہمیت سے وہ قطعی واقف نہیں تھے۔ چنانچہ احتجاج کے طور پر میں نے کشمیر آپریشن کی نگرانی سے استعفیٰ دے دیا (صفحہ ۲۳۱۔۲۳۲)

سردار شوکت حیات خاں کا یہ بیان اس دردناک حقیقت کی ایک واضح مثال ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈر کس طرح مذکورہ مثل کا شکار ہوئے ہیں۔ وہ ممکن اور ناممکن کے فرق کو سمجھ نہ سکے۔ وہ نہ ملنے والی چیز کو پانے کے لئے دوڑے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملنے والی چیز بھی ان سے کھوئی گئی اور نہ ملنے والی چیز تو سرے سے ملنے والی ہی نہ تھی۔

۲۔ اب اس نوعیت کی ایک اور مثال لیجئے۔ اس مثال کا تعلق ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور سے ہے جب کہ برصغیر ہند میں انگریزوں کا سیاسی اقتدار قائم تھا۔ اس مثال کو اردو ہفت روزہ الجمعیۃ سے لے کر یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس امروہہ (۳۔۵ مئی ۱۹۳۰ء) سے کچھ روز قبل وائسرائے ہند کی کونسل کے ایک ذمہ دار ممبر سر میاں فضل حسین مرحوم نے سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلوی کو بلا کر یہ پیش کش کی کہ آپ جمعیۃ علماء کے اجلاس امروہہ میں کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کی تجویز پاس نہ ہونے دیں۔ میں حکومت برطانیہ سے مقبرہ صفدر جنگ اور اس سے ملحقہ جائداد بمعہ اراضی جمعیۃ علماء ہند کے علمی کاموں کے لئے دلوادوں گا۔ حضرت مولانا نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں فرمایا "میاں صاحب! تمام علماء کرام وزعماء عظام مجھے بے وقوف نہیں بنائیں گے کہ ہم پورے ملک کو حاصل کرنے کی تجویز پاس کر رہے ہیں اور تم صرف ایک مقبرہ وہ بھی مسلمانوں کی وقف ملکیت پر فیصلہ کر رہے ہو۔ مولانا کے جواب سے میاں صاحب موصوف کو بہت مایوسی ہوئی۔ یہ واقعہ حضرت مولانا نے راقم الحروف سے خود بیان فرمایا تھا۔

(جمعیۃ علماء ہند کا پچاس سالہ عہد، از شیخ عبدالحق پراچہ دہلوی ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء صوبہ دہلی، مطبوعہ الجمعیۃ ویکلی، دہلی، ۲ جنوری ۱۹۷۰ء، صفحہ ۸)

۱۹۳۰ء کے اس واقعہ کو اب ۷۵ سال کے بعد کے حالات کی روشنی میں دیکھئے تو معلوم

ہوگا کہ اس معاملہ میں وہی صورت پیش آئی جس کا ذکر مذکورہ عوامی مثل میں کیا گیا ہے، پچھتر سال پہلے کے رہنماؤں کو ایک نہایت قیمتی موقع کسی کوشش کے بغیر مل رہا تھا مگر وہ اس قیمتی موقع سے صرف اس لئے فائدہ نہ اٹھا سکے کہ ان کے ذہن میں ایک بہت بڑی چیز بسی ہوئی تھی۔ اگرچہ حقیقتِ واقعہ کے اعتبار سے وہ چیز انہیں ملنے والی ہی نہ تھی۔

انگریزوں کی مذکورہ پیش کش اپنے امکانات کے اعتبار سے وہی اہمیت رکھتی تھی جس کی پیش کش مغل بادشاہ جہانگیر کے زمانہ میں انگریز تاجر کو کی گئی۔ اور اس نے اس کو فوراً قبول کر لیا۔ پچھتر سال پہلے کے مسلم رہنما اگر انگریز کی مذکورہ پیش کش کو قبول کر لیتے اور اس کو علمی اور تعلیمی اور دعوتی مرکز بنا دیتے تو اس کے نتائج اتنے دور رس نکلتے کہ شاید تاریخ کا نقشہ ہی کچھ دوسرا ہوتا۔

اوپر جو دو مثالیں پیش کی گئیں یہی موجودہ زمانہ کے تقریباً تمام مشہور رہنماؤں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے لئے کام کے عظیم مواقع موجود تھے۔ مگر تقریباً ہر ایک کا یہ حال ہوا کہ وہ ناممکن کو نشانہ بنا کر اس کی طرف دوڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ممکن کو بھی حاصل نہ کر سکا اور ناممکن تو حاصل ہونے والا ہی نہ تھا۔

مثلاً سید جمال الدین افغانی کو ترکی کی عثمانی سلطنت نے کام کے عظیم مواقع دیے مگر جمال الدین افغانی خود عثمانی سلطنت کی جڑ اکھاڑنے پر تل گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں ترکی کو چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا، مصر کے سید قطب کو وزارت تعلیم بہت چھوٹی چیز لگی۔ وہ خود ناصر کے سیاسی اقتدار کو ختم کرنے کے درپے ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں چھوٹی چیز اور بڑی چیز دونوں ہی سے محروم ہونا پڑا۔

یہی معاملہ پاکستان میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ساتھ پیش آیا۔ وہاں کے سابق حکمراں صدر محمد ایوب خاں نے سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے ساتھیوں کو یہ پیش کش کی کہ وہ حکومت کے مکمل تعاون سے پاکستان میں بڑے پیمانہ پر ایک نیشنل یونیورسٹی بنائیں اور اس کے ذریعہ وہ نئی

نسل کی تعلیم وتربیت پر کام کریں۔ مگر دوبارہ یہی ہوا کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کو مذکورہ پیش کش چھوٹی معلوم ہوئی۔ انہوں نے پوری حکومت پر قبضہ کرنے کی دھنوادھار تحریک شروع کر دی مگر تمام کوششوں کے بعد آخر کار جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ وہ چھوٹی چیز اور بڑی چیز دونوں ہی سے محروم ہو کر رہ گئے۔

یہی موجودہ زمانہ کے اکثر مسلم رہنماؤں کی کہانی ہے۔ وہ اپنی خیالی امنگوں میں اتنا گم ہوئے کہ انہیں حقائق وواقعات کی خبر نہ ہو سکی۔ وہ بڑے بڑے نشانوں کو اپنا مقصد بنا کر ان کی طرف دوڑتے رہے، حالانکہ یہ نشانے سرے سے ان کے لئے قابل حصول ہی نہ تھے۔ اور جو چیز ان کے لئے حالات کے اعتبار سے قابل حصول تھی وہ انہیں دکھائی ہی نہ دی۔ اسی غیر حقیقت پسندانہ مزاج کا نتیجہ ہے کہ ان مشہور رہنماؤں نے صرف ناکام اقدامات کی مثالیں قائم کیں، وہ کامیاب اور نتیجہ خیز اقدام کی مثال قائم نہ کر سکے۔ زیادہ کو پانے کی کوشش میں وہ تھوڑے سے بھی محروم رہے۔

مسلم رہنماؤں کی اس بھیانک غلطی کا سبب یہ تھا کہ تھوڑے کو وہ صرف تھوڑا سمجھے، وہ تھوڑے کو زیادہ کے روپ میں نہ دیکھ سکے۔ وہ زندگی کے اس راز سے نا آشنا رہے کہ عمل کا آغاز ہمیشہ تھوڑے سے کیا جاتا ہے، زیادہ سے عمل کا آغاز ممکن نہیں، جو آدمی اس راز کو سمجھ لے وہ تھوڑے سے شروع کر کے آخر کار زیادہ تک پہنچ جائے گا۔ اور جو شخص اس راز کو نہ سمجھے وہ اپنے غیر حقیقت پسندانہ مزاج کی بنا پر اپنے عمل کا نقطۂ آغاز ہی نہ پائے گا۔ اس دنیا کا قانون یہ ہے کہ جو آدمی اپنے سفر کا نقطۂ آغاز پالے وہ کبھی نہ کبھی اپنی منزل تک پہنچ جائے گا، اور جو آدمی اپنے سفر کا نقطۂ آغاز نہ پائے وہ کبھی اپنی منزل تک نہ پہنچے گا خواہ وہ ساری عمر بے فائدہ دوڑ دھوپ کرتا رہے ـــــ زندگی کے اسی اصول کا نام دینی اصلاح میں قناعت ہے اور قناعت بلاشبہہ ہر قسم کی انفرادی اور اجتماعی کامیابیوں کا واحد راز ہے۔

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں معمولی لفظی فرق کے ساتھ آئی ہے۔ مثلاً

مسلم، کتاب الزکاۃ۔ الترمذی، کتاب الزھد۔ مسند احمد بن حنبل، وغیرہ۔ مسند احمد کے الفاظ یہ ہیں: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال قد أفلح من أسلم رزق كفافاً و قنعه الله بما أتاه (مسند أحمد ۲/۱۶۸) یعنی اس شخص نے فلاح پائی جس نے اسلام قبول کیا اور اس کو بقدر ضرورت رزق ملا اور اللہ نے اس کو اس پر قناعت دی جو اس کو اس نے دیا۔

اس حدیث کو عام طور پر انفرادی معنوں میں اور معاشی مفہوم میں لیا جاتا ہے۔ مگر وہ اس سے بہت زیادہ وسیع ہے، اس حدیث کا پورا مطلب یہ ہے کہ افراد یا قوموں کو موجودہ زمانہ میں جو کچھ ملے یا حالات کے اعتبار سے جو ان کے لئے ممکن ہو اس کو وہ خوش دلی کے ساتھ قبول کر لیں، اس پر راضی رہتے ہوئے وہ اپنا علم شروع کر دیں۔ اس کا پہلا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ ملے ہوئے کو پانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ جو کچھ ان کو حال میں حاصل نہیں، وہ ان کی منصوبہ بند جدوجہد کے نتیجہ میں مستقبل میں حاصل ہو جائے۔

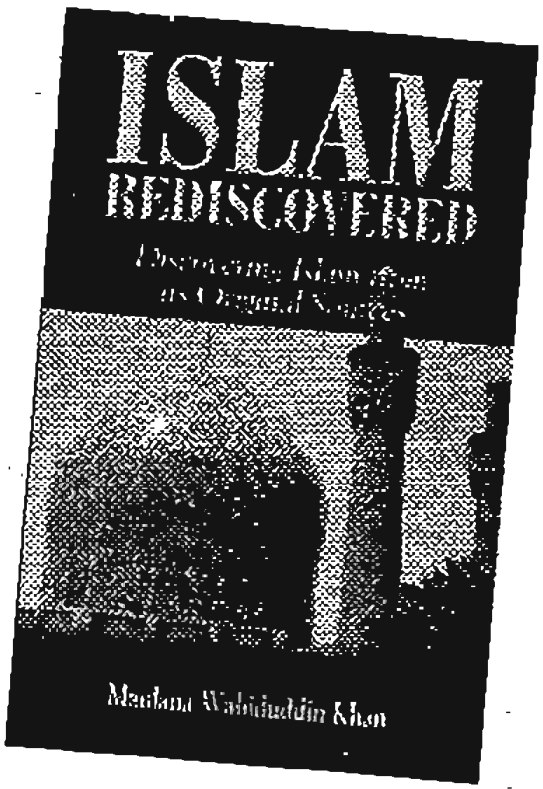

ISLAM
REDISCOVERED
Discovering Islam from its Original Sources
By Maulana Wahiduddin Khan

Rs. 195.00
ISBN: 81-87570-40-7

Goodword
B·O·O·K·S

1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 435 5454, 435 6666, 435 1128
Fax: 435 7333, 435 7980
e-mail: skhan@vsnl.com

خشیتِ انسانی کے دور کا خاتمہ

قرآن کی سورہ نمبر ۵ میں وہ آیت ہے جو پیغمبر اسلام ﷺ کے آخری دور میں اتری۔ اس آیت میں ایک اہم تاریخی اعلان کیا گیا۔ وہ اعلان یہ تھا کہ اب اہل توحید کے لئے خشیتِ انسانی کا دور ختم ہو گیا۔ اسلام کے بعد توحید کی تاریخ اب خشیتِ خداوندی کے دور میں داخل ہو گئی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: "آج انکار کرنے والے تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہو گئے۔ پس تم ان سے نہ ڈرو، اور تم مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمارے دین کو تمہارے لئے کامل کر دیا اور تمہارے اوپر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا" (المائدۃ ۳)

اصل یہ ہے کہ توحید کی تحریک کا ایک دور اسلام پر ختم ہوتا ہے اور اس تحریک کا دوسرا دور اسلام سے شروع ہوتا ہے۔ اسلام سے پہلے جو دور گزرا ہے اس میں مسلسل طور پر توحید کی تحریک خشیتِ انسانی کے مسئلہ سے دوچار رہی۔ قرآن کی سورہ البروج میں اسی قدیم ناموافق دور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور سورہ البقرہ میں اسی ناموافق صورت حال سے نجات کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی گئی ہے (البقرۃ ۲۸۶)۔

اسی قدیم ناموافق صورت حال کو قرآن میں فتنہ کہا گیا ہے، اور حکم دیا گیا ہے کہ اہل فتنہ سے لڑو تاکہ فتنہ کی حالت ختم ہو جائے اور دین سب اللہ کے لئے ہو جائے (الانفال ۳۹)۔ فتنہ کے معنی آزمائش یا روکنے کے ہیں۔ عربی میں کہا جاتا ہے کہ فتن فلاناً عن رایہ۔ "اس نے فلاں شخص کو اس کی رائے سے روک دیا"۔

یہاں فتنہ سے مراد وہ غیر فطری حالت ہے جو اللہ کی تخلیقی اسکیم کے خلاف اہل باطل نے دنیا میں قائم کر رکھی تھی۔ اس قدیم دور میں وہ فطری حالت ختم ہو گئی تھی جو اللہ کو اپنی اس دنیا کے لئے مطلوب ہے۔ یعنی لوگوں کے لئے آزادانہ طور پر یہ موقع ہونا کہ وہ جس چیز کو حق

سمجھیں اس کو اختیار کر سکیں۔ مذکورہ آیت میں رسول اور اصحاب رسول کو یہ حکم دیا گیا کہ تم لوگ اوّلاً پر امن کوشش سے اور اگر ناگزیر ہو تو مسلح کوشش کے ذریعہ اس غیر فطری صورت حال کو ختم کردو۔ تم اپنی کوشش اس وقت تک جاری رکھو جب تک کہ اللہ کے تخلیقی نقشہ کے مطابق فطری حالت پوری طرح قائم نہ ہو جائے۔

رسول اور اصحاب رسول کے ذریعہ ساتویں صدی میں جو انقلاب لایا گیا وہ اسی مقصد کے تحت تھا۔ یہ انقلاب گویا انسانی تاریخ کو ری پروسس (re-process) کرنے کے ہم معنی تھا۔ اس انقلاب نے انسانی تاریخ میں ایک نیا عمل (process) جاری کر دیا۔ یہ عمل اپنی پوری طاقت کے ساتھ تقریباً ایک ہزار سال تک جاری رہا، یہاں تک کہ وہ اپنے نقطۂ اختتام تک پہنچ گیا۔ اب ہم اللہ کے فضل سے اسی نئے دور میں جی رہے ہیں۔ گویا اب اصحاب رسول کی وہ دعا اپنے قبولیت کے تکمیلی دور میں پہنچ گئی ہے جس کو قرآن میں ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے: "ربنا ولا تحمل علینا اصراً کما حملته علی الذین من قبلنا" (البقرہ ۲۸۶) یعنی اے ہمارے رب، ہمارے اوپر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے پچھلے لوگوں پر ڈالا تھا۔

اسلامی انقلاب کے بعد ساری دنیا میں تدریجی طور پر ایک عظیم تبدیلی آئی ہے۔ اس تبدیلی کے کچھ خاص پہلو یہ ہیں ــــــ توہماتی سوچ کے بجائے سائنٹفک طرز فکر کا ظہور میں آنا، مذہبی جبر کے بجائے مذہبی آزادی کا دور شروع ہونا، مطلق العنان بادشاہی کے بجائے جمہوری سیاست کا پیدا ہونا۔ ذہنی تنگ نظری کے بجائے ذہنی کھلے پن کا رائج ہونا۔ متشددانہ طریقہ کے بجائے پر امن طریقہ کی اہمیت کا مسلّم ہونا۔ اندھی تقلید کے بجائے دلیل پر مبنی رائے کا معتبر قرار پانا، نسلی اور طبقاتی تفریق کے بجائے انسانی مساوات کا قائم ہونا، وغیرہ۔

مذکورہ آیت سے مراد یہی عالمی تبدیلیاں ہیں۔ ان تبدیلیوں نے توحید کی دعوت کو اب ہر خطرہ سے باہر کر دیا ہے۔ قدیم زمانے کی طرح، اب یہ اندیشہ نہیں کہ کوئی موحد توحید کا اعلان کرے تو اس کو یہ کہہ کر جبراً روک دیا جائے کہ تمہارا یہ اعلان سرکاری مذہب کے خلاف ہے۔

اب دعوت توحید کے لئے یہ خطرہ نہیں کہ کچھ لوگ صرف اندھی عصبیت کی بنا پر اس کے دشمن ہو جائیں۔ اب موحدین کے گروہ کو اس مسئلہ کا سامنا پیش نہیں آسکتا کہ نسلی عصبیت کی بنا پر ان کی دعوت کو رد کر دیا جائے۔ اب موحدین کے لئے ایسا ہونے والا نہیں کہ وہ انتہائی پر امن انداز میں اپنی دعوت دیں اور پھر بھی انہیں اپنا کام کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں اگر کوئی فرد یا گروہ 'اسلام خطرہ میں ہے' (Islam is in danger) کے تصور کی بنیاد پر کوئی اسلامی تحریک اٹھائے تو وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے خلاف زمانہ روش (anachronism) کے ہم معنی ہو گی۔ اب قرآن کے مطابق، وہی اسلامی تحریک درست تحریک ہے جو 'اسلام خطرہ سے باہر ہے' (Islam is out of danger) کے نظریہ کی بنیاد پر اٹھائی گئی ہو۔

مذکورہ قرآنی آیت بتاتی ہے کہ اب اہل اسلام کے لئے ان کی سوچ کا نقطۂ آغاز (starting point) کیا ہونا چاہئے۔ حالات خواہ بظاہر جیسے بھی ہوں، اہل اسلام کو یہ یقین کرنا چاہئے کہ بعد کے دور میں اسلام کبھی بھی خطرہ میں نہیں ہو سکتا۔ ان کا طرز فکر ہر حال میں یہ ہونا چاہئے کہ اسلام اب خطرہ سے باہر ہے۔ اس لئے انہیں پیشگی طور پر یہ سمجھ کر اپنا منصوبہ بنانا چاہئے کہ ان کے منصوبہ کے اجراء اور تکمیل کے لئے اب کوئی حقیقی خطرہ یا رکاوٹ موجود نہیں۔

اسی سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اگر کبھی کسی مقام پر اہل اسلام کی کسی تحریک کو خطرہ کی صورت حال پیش آئے تو اس کا سبب تلاش کرنے کے لئے انہیں باہر دیکھنے کے بجائے خود اپنے اندر دیکھنا چاہئے۔ کیوں کہ یہ خطرہ یقینی طور پر کسی خارجی سازش کی بنا پر نہ ہو گا بلکہ داخلی غلطی کی بنا پر ہو گا۔ اس لئے اب اہل اسلام کو چاہئے کہ وہ اپنی ساری توجہ داخلی کوتاہی کو دور کرنے پر لگائیں نہ کہ باہر کے مفروضہ دشمنوں سے ٹکراؤ پر۔

قرآن میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ: قد افلح المومنون الذین هم فی صلاتهم خاشعون (المومنون ۱-۲) یعنی یقیناً فلاح پا گئے ایمان والے جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں۔ اسی حقیقت

کا اعلان ہر نماز سے پہلے مؤذن کی زبان سے ان الفاظ میں کیا جاتا ہے "حی علی الفلاح"۔

اب اگر کوئی شخص یہ نظریہ قائم کرے کہ نماز موجودہ زمانہ میں فلاح کا ذریعہ نہیں کیوں کہ وہ روزانہ پانچ بار لوگوں کا وقت لیتی رہتی ہے، نیز یہ کہ وہ لوگوں کے ذہن کو موجودہ دنیا کی حقیقتوں سے ہٹانے کا سبب بنتی ہے تو ایسے نظریہ کو فوراً ہی رد کر دیا جائے گا۔ کیوں کہ یہ نظریہ فلاح کو کسی اور چیز کے ساتھ جوڑ رہا ہے، جب کہ قرآن میں فلاح کو نماز کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔

اسی طرح قرآن کے مذکورہ اعلان کے بعد "اسلام خطرہ میں ہے" کے نظریہ کی بنیاد پر اٹھائی جانے والی تحریک بلا بحث ہی قابل رد ہے، کیوں کہ وہ قرآن کے واضح اعلان کی نفی کے ہم معنی ہے۔ اب صرف وہی تحریک درست اور جائز ہے جو "اسلام خطرہ سے باہر" کے نظریہ کی بنیاد پر اٹھائی گئی ہو۔

موجودہ زمانہ میں کچھ لوگوں نے اسلام کے نام پر پر تشدد سیاسی تحریکیں اٹھائیں۔ اس کے نتیجہ میں ان کا ٹکراؤ وقت کے حکمرانوں سے ہوا۔ ان حکمرانوں نے تحریک کے علم برداروں کو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا۔ اس طرح کے واقعات کا یہ مطلب نہیں کہ خشیت انسانی کے حالات آج بھی دنیا میں باقی ہیں۔ ان تحریکوں کو جس سیاسی تشدد کا سامنا کرنا پڑا وہ ان کی اپنی نادانی کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے اسلام کے نام پر غیر اسلامی تحریکیں چلائیں۔ انہوں نے اقتدار کو چھیننے کی تحریک اٹھائی جب کہ صحیح اسلامی تحریک وہ ہے جو لوگوں کو اللہ کی رحمت دینے کے لئے اٹھائی جائے۔

ایسی حالت میں موجودہ زمانہ کی سیاسی تحریکوں کے ساتھ جو متشددانہ واقعات پیش آئے وہ ان کی اپنی نادانی کا نتیجہ تھے نہ کہ حقیقۃً اسلام کی تعلیمات کا نتیجہ۔

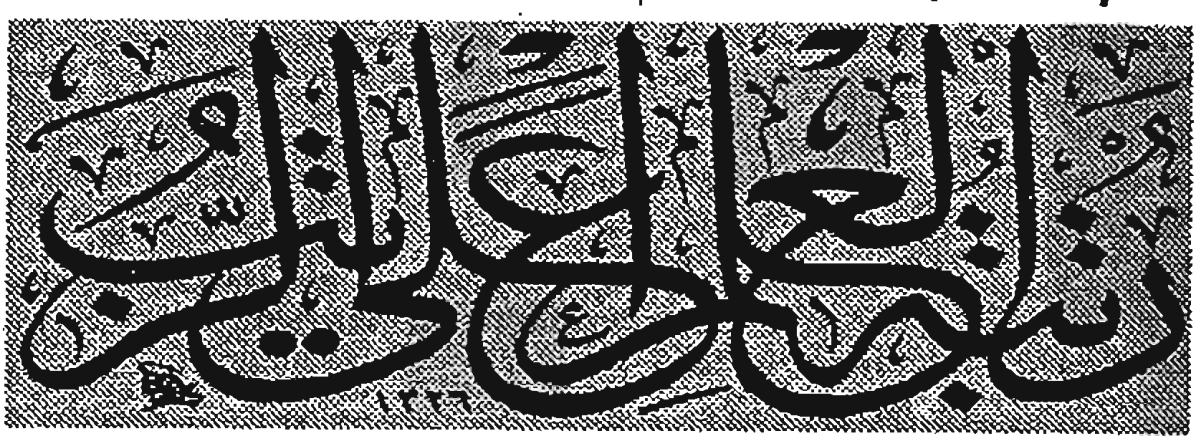

اسلام کا طریق انقلاب

اسلام کا طریق انقلاب انسانی زندگی میں عین وہی ہے جو نباتات کی زندگی میں درخت کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ درخت اپنی ذات میں ایک مکمل وجود ہے۔ مگر اس مکمل وجود کو ظہور میں لانے کا کام بیج سے شروع ہوتا ہے نہ کہ مکمل درخت سے۔ درخت دراصل بیج کے تدریجی مراحل سے گذر کر اپنی تکمیل تک پہنچنے کا دوسرا نام ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ انسانی زندگی کا ہے۔ انسانی زندگی میں اصلاح کا عمل فرد کے اندر انقلاب سے شروع ہوتا ہے اور پھر ضروری تدریجی مراحل سے گزرتے ہوئے مکمل انقلاب کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس کے برعکس اجتماعی زندگی سے عمل کا آغاز کرنا گویا گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنا ہے۔ یہ ایک غیر فطری طریقہ ہے جو خدائی منصوبہ کے سراسر خلاف ہے۔ اس قسم کا غیر فطری منصوبہ کبھی موجودہ دنیا میں کامیاب ہونے والا نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں ایمان اور مومن کے معاملہ کو درخت جیسا ایک معاملہ بتایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے: کیا تم نے نہیں دیکھا، کس طرح مثال بیان فرمائی اللہ نے کلمۂ طیبہ کی۔ وہ ایک پاکیزہ درخت کی مانند ہے جس کی جڑ زمین میں جمی ہوئی ہے اور جس کی شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ وہ ہر حین پر اپنا پھل دیتا ہے اپنے رب کے حکم سے اور اللہ لوگوں کے لئے مثال بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ (ابراھیم ۲۴۔۲۵)

ایک جائزہ

موجودہ زمانہ کی مسلم دنیا میں ایک عجیب و غریب منظر دکھائی دیتا ہے۔ پچھلے کئی سو سال کے دوران ساری مسلم دنیا میں بڑے بڑے انقلابی رہنما اٹھے۔ انہوں نے ہنگامہ خیز تحریکیں چلائیں۔ مسلمانوں نے جان و مال کی بے شمار قربانیوں کے ذریعہ ان کا ساتھ دیا۔ مگر یہ تمام کی تمام تحریکیں ظاہری ہنگاموں کے باوجود حبط اعمال کا شکار ہو گئیں۔ ان کا کوئی بھی مثبت نتیجہ ملت کے

حصہ میں نہیں آیا۔

سب سے پہلے پوری مسلم دنیا میں مغربی استعمار کے خلاف تحریک اٹھائی گئی۔ مگر لمبی خونیں جدوجہد کے بعد جب مغربی استعمار کا خاتمہ ہوا تو معلوم ہوا کہ ہر مسلم ملک میں مغرب پسند مسلمان لیڈروں نے حکمرانی کے مقام پر قبضہ کرلیا ہے۔ اب ان مسلم حکمرانوں کے خلاف تحریکیں شروع ہوئیں۔ کسی کو جلاوطن کیا گیا، کسی کو گولی ماری گئی۔ کسی کو پھانسی دی گئی۔ ابھی یہ عمل جاری تھا کہ معلوم ہوا کہ میڈیا اور ٹی وی کے ذریعہ مغربی تہذیب ہر مسلم گھر میں نئے راستوں سے داخل ہوگئی ہے۔ اب ملکی ٹی وی اسٹیشنوں کو توڑنے کی مہم شروع ہوئی۔ مگر فتح کے نعروں کے درمیان انکشاف ہوا کہ غیر مسلم ملکوں کی ٹی وی نشریات فضا کے ذریعہ ہر مسلم گھر میں داخل ہو رہی ہیں۔ مسلم عورتوں اور مسلم مردانہیں انتہائی دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہے ہیں۔ اب چھتوں کے ڈش انٹینا توڑے جانے لگے تاکہ مسلمان غیر ملکی ٹی وی نہ دیکھ سکیں۔ مگر عین اسی وقت معلوم ہوا کہ دنیا انٹرنیٹ کے دور میں داخل ہوگئی ہے۔

اب حال یہ ہے کہ جن اخبارات کے دفتروں کو مسلم ملکوں میں جلایا جاتا ہے یا جن کتابوں کو مسلم دشمن بتا کر ان کے اوپر پابندی (ban) لگائی جاتی ہے وہ سب کے سب انٹرنیٹ کے ذریعہ پہلے سے بھی زیادہ بڑے پیمانہ پر ساری دنیا میں پہنچ رہی ہیں۔ اور انٹرنیٹ وہ بلا ہے جس کے پھیلاؤ کو روکنا کسی سپر پاور کے بس میں بھی نہیں۔

غلطی کہاں ہے

یہاں سوال یہ ہے کہ اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اہل ایمان کی کوششوں کو بار آور کرے گا پھر موجودہ زمانہ میں برعکس طور پر کیوں ایسا ہو رہا ہے کہ مسلم رہنماؤں کی کوششیں ایک کے بعد ایک مکمل طور پر بے نتیجہ ہوتی جارہی ہیں۔

اس کا سبب یہ ہے کہ ان نام نہاد اسلامی قائدین کا نشانۂ عمل ہی غلط تھا۔ وہ اپنی تمام کوششیں سسٹم کو بدلنے پر لگاتے رہے۔ جب کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ فرد کو بدلنے پر ساری

کوشش صرف کی جائے۔ سسٹم پر عمل کرنا درخت کی شاخوں پر عمل کرنا ہے۔ اور فرد یا ذہن پر عمل کرنا درخت کی جڑوں پر عمل کرنا۔ درخت کی شاخوں پر عمل خدا کی اس دنیا میں کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس اگر درخت کی جڑوں پر عمل کیا جائے تو نتیجہ اتنا ہی یقینی ہو جاتا ہے جتنا شام کے بعد اگلی صبح کو سورج کا نکلنا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے اصل کام یہ ہے کہ فرد کو بدلا جائے۔ فرد کی سوچ میں تبدیلی لائی جائے۔ فرد کی پسند ناپسند کے معیار کو درست کیا جائے۔ فرد کے اندر غیر حق پسندی کے مزاج کو ختم کر کے اس کو حق پسند بنایا جائے۔ فرد بدلے گا تو انسان بدلے گا۔ انسان بدلے گا تو سماج بدلے گا۔ اور جب سماج بدلے گا تو اس کے بعد سسٹم اپنے آپ بدل جائے گا۔

مبنی بر نظام جدو جہد کے مقابلہ میں مبنی بر انسان جدو جہد کی اہمیت یہ ہے کہ ہر چیز آخر کار انسان کے ہاتھ میں ہے۔ باطل نظام کو بدلنے کے نام سے پچھلی صدیوں میں جن چیزوں کے خلاف تحریکیں چلائی گئیں ان سب کو بنانے اور چلانے والا براہ راست یا بالواسطہ طور پر انسان ہی تھا۔ کوئی بھی نظام اپنے آپ وجود میں نہیں آتا۔ بلکہ کچھ انسان اس کو وجود میں لاتے ہیں۔ اس لئے نظام کو بدلنے کا کام انسان کو بدلنے سے شروع ہوگا، جس طرح درخت کو وجود میں لانے کا عمل بیج پر عمل سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسرا طریقہ اس دنیا میں نہ ممکن ہے اور نہ نتیجہ خیز۔

قرآن وحدیث کی روشنی میں

قرآن اور حدیث کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے نزدیک انسانی اصلاح کے معاملہ میں اصل اہمیت قلب کی ہے۔ اسلامی جدو جہد کا سارا نشانہ یہ ہے کہ انسان کے قلب کو بدلا جائے۔ قلب ہی کی درستگی پر کسی انسان کو جنت کا داخلہ ملتا ہے جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: إلا من أتى الله بقلب سليم (الشعراء ۸۹) یعنی جنت میں داخلہ صرف اس شخص کو ملے گا جو قلبِ سلیم کے ساتھ وہاں پہنچے۔

یہی بات حدیث میں مختلف انداز سے بیان ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک حدیث وہ ہے جو صحیح مسلم، ابن ماجہ، الدارمی وغیرہ میں آئی ہے۔ صحیح البخاری (کتاب الایمان) کے الفاظ یہ ہیں: ألا و إن فی الجسد مضغة إذا صلحت صلح الجسد کلّه، وإذا فسدت فسد الجسد کله، ألا وهی القلب (سن لو کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، جب وہ درست ہوتا ہے تو پورا جسم درست ہو جاتا ہے اور جب وہ بگڑتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ سن لو کہ وہ قلب ہے۔)

اسلام میں انسان کی جو اہم صفات بتائی گئی ہیں ان سب کا تعلق قلب سے ہے۔ مثلاً معرفت، اخلاص، حسن نیت، تقویٰ، شکر، خشوع، تضرع، انابت، اخبات، وغیرہ، سب کا سرچشمہ قلب ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کی پوری تحریک قلب پر مبنی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں، انسان سے جو چیز مطلوب ہے وہ داخل القلب ایمان (الحجرات ۱۴) ہے۔ اسلام پہلے قلب کے اندر جڑ پکڑتا ہے، اس کے بعد وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنا نتیجہ ظاہر کرتا ہے۔

یہ قلب کہاں ہوتا ہے۔ قلب نہ سماج میں ہوتا ہے اور نہ حکومتی ادارہ یا سیاسی نظام میں۔ قلب ہمیشہ ایک فرد انسانی میں ہوتا ہے۔ سماج یا سیاسی ادارہ افراد ہی کے مجموعے کا ایک علامتی نام ہے۔ افراد سے الگ ہو کر سماجی نظام یا سیاسی ادارہ کا کوئی وجود ہی نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی تحریک کا اصل نشانہ فرد ہے، سماجی یا سیاسی نظام اسلامی تحریک کا براہ راست نشانہ نہیں۔ اسلام کا تقاضہ ہے کہ اصلاح کی ساری کوشش افرادِ انسانی پر جاری کی جائے کیوں کہ افراد ہی کی اصلاح سے اجتماعی زندگی کی اصلاح ہوگی، اور افراد ہی کے بگڑنے سے اجتماعی زندگی بگڑ جائے گی۔

اسلامی تاریخ کی مثال

اسلامی تاریخ اس اصول کی ایک نہایت کامیاب مثال ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم

نے اپنے بعد امت کو جو ہدایات دیں، ان میں ایک انتہائی اہم ہدایت یہ تھی کہ سیاسی نظام میں بگاڑ ہو تب بھی تم لوگ نظام سے نہ ٹکرانا بلکہ نظام (سسٹم) کو نظر انداز کرتے ہوئے فرد کی اصلاح پر اپنی ساری کوششیں جاری رکھنا۔ (تفصیلی حوالوں کے لئے ملاحظہ ہو 'فکر اسلامی')

واقعات بتاتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں کچھ مسلم رہنماؤں کے استثناء کو چھوڑ کر اسلام کی اب تک کی پوری تاریخ میں پیغمبر اسلام کی اس ہدایت پر عمل ہوتا رہا ہے۔ خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ کے زمانہ ہی میں سیاسی بگاڑ آگیا تھا۔ یہ بگاڑ انیسویں صدی کے مسلم حکمرانوں تک جاری رہا۔ مگر ہر دور میں امت کے نمائندہ لوگوں نے اعراض کی پالیسی اختیار کی۔ وہ مختلف پہلوؤں سے اس کام پر لگے رہے جس کو ہم نے اصلاح افراد یا اصلاح قلب کا نام دیا ہے۔ صحابہ، تابعین، تبع تابعین، محدثین، فقہاء، علماء اور صوفیاء ہر دور میں کثیر تعداد میں پیدا ہوئے مگر تقریباً ہر ایک نے اصلاح پر اپنے آپ کو وقف رکھا۔ وہ موجودہ طرز کے انقلابِ نظام والے کام میں کبھی مشغول نہیں ہوئے۔

اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ اسلام کی پچھلی ہزار سالہ تاریخ ان تباہیوں سے پاک رہی جس کا نمونہ موجودہ زمانہ میں دیکھا جا رہا ہے۔ اسلامی ادارے پر سکون طور پر کام کرتے رہے۔ اسلامی علوم کی خدمت موافق حالات میں جاری رہی۔ دعوت و اصلاح کا کام کسی رکاوٹ کے بغیر فطری انداز میں جاری رہا۔ مسلم معاشرہ میں کم و بیش اسلامی قدروں کا رواج ہر دور میں باقی رہا، وغیرہ۔

تفسیر کے نام پر تحریف

مذکورہ برائی کی آخری بدترین صورت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ایسے مسلم مفکرین اٹھے جنھوں نے اسلام کی محرفانہ تعبیر کر کے انقلاب نظام کے کام ہی کو امت مسلمہ کا مشن ثابت کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے شرک کی فہرست میں "سیاسی شرک" کا اضافہ کیا۔ انہوں نے طاغوت کے مفہوم میں خود ساختہ توسیع کر کے سیکولر حکمرانوں کو طاغوت کے ہم معنی قرار دیا۔ انہوں نے عبادت کو اطاعت بتایا اور اس کے بعد ساری سیاست کو اس میں داخل کر دیا۔ انہوں نے حکم کو

فوق الفطری حکم کے بجائے سیاسی حکم کے ہم معنی بنا کر اعلان کیا کہ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم خدا کی سیاسی حکمرانی کو زمین پر قائم کریں۔ قرآن کے لازم کو متعدی بنا کر یہ کیا کہ عدل کی پیروی کرنے کے بجائے عدل کا جھنڈا اٹھانے کو مسلمانوں کا فریضۂ منصبی قرار دیا۔ انہوں نے دعوت کو عملی شہادت سے جوڑ کر یہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کی کہ جب تک سیاسی اقتدار پر قبضہ کر کے زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی قوانین جاری نہ کئے جائیں اس وقت تک دعوت و شہادت کا کام انجام ہی نہیں دیا جا سکتا، وغیرہ۔

اس قسم کی ہر تعبیر سراسر محرفانہ تعبیر ہے۔ وہ اسلام کے پورے ڈھانچے کو بدل دینے والی ہے۔ ان تعبیرات کا نتیجہ صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ان سے متاثر ہونے والوں کے اندر احتسابِ خویش کے بجائے احتساب غیر کا مزاج پیدا ہو۔ ان کے اندر متقیانہ ذہن کے بجائے سیاسی ذہن تشکیل پائے، وہ اہل عالم کو مدعو کے بجائے حریف کی نظر سے دیکھنے لگیں، وہ محبت انسانیت کے بجائے نفرتِ انسانیت میں جینے لگیں۔ وہ مسلم معاشرہ کو حکمراں اور غیر حکمراں میں تقسیم کر کے لامتناہی قسم کی باہمی نزاع چھیڑ دیں۔ وہ لوگوں کو تعمیری کام کے بجائے تخریبی کام میں مشغول کر دیں۔ خلاصہ یہ کہ اسلام کے نام پر وہ لوگوں کو غیر اسلام کی راہوں میں دوڑا دیں۔

تفسیر بالرائے

قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کرنا ایک گناہ کا فعل ہے۔ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر قرآن کی کسی آیت کا غلط مفہوم بیان کرے تو یہ تحریف ہے، (البقرہ ۷۵) اور قرآن میں اس قسم کی تحریف بلاشبہہ ایک ناقابل معافی جرم ہے۔

یہ معاملہ اتنا زیادہ نازک ہے کہ محض اپنی رائے کے تحت کی ہوئی تفسیر اگر بالفرض درست ہو، تب بھی یہ اندیشہ ہے کہ وہ آدمی کے لئے گناہ کا سبب نہ بن جائے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "من قال فی کتاب اللہ عزو جل برأیه فأصاب فقد أخطأ" (سنن ابی داؤد، کتاب العلم ۳/۳۱۹) یعنی جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی کتاب میں اپنی رائے سے کہا اور اس نے صحیح کہا تب بھی اس نے غلطی کی۔

ضروری تفسیری تقاضوں کو پورا کئے بغیر محض اپنی رائے سے قرآن کا مفہوم بیان کرنا ایک غیر محتاط روش ہے۔ اس لئے ایسے کسی آدمی کی تفسیر اگر اتفاقاً درست ہو تب بھی ایسا شخص اپنی غیر محتاط روش کی بنا پر غلط کار ٹھہرے گا۔ ایسے آدمی کو صحیح تفسیر کرنے کا انعام نہیں مل سکتا۔

تفسیر قرآن کے سلسلے میں کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ حدیث اور آثار میں جو تفسیریں منقول ہیں یا قدماء نے قرآنی آیات کی جو تفسیریں بیان کی ہیں، تفسیر قرآن کا کام بس اسی دائرے کے اندر ہونا چاہئے۔ گویا بعد کی مسلم نسلوں کا کام صرف یہ ہے کہ وہ ابتدائی دور کے علماء اور مفسرین کے اقوال کو دہراتے رہیں۔ مگر مذکورہ حدیث کا یہ مطلب درست نہیں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ قرآن ایک بابرکت کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف اتاری ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر تدبر کریں اور تاکہ عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں (ص ۲۹) قرآن جب ایک ایسی کتاب ہے جس پر ہر قاری تدبر اور غور و فکر کرے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ صرف پچھلی بیان کردہ باتوں کو پڑھا جائے اور بس انہیں کو دہرایا جاتا رہے۔ تدبر کا

لفظ اپنے آپ میں اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن کے قاری سے یہ مطلوب ہے کہ وہ گہرے غور و فکر سے اس میں نئے نئے معانی دریافت کرے اور ان سے اپنے ایمانی شعور میں اضافہ کرتا رہے۔ قرآن میں اگر یہ صفت نہ ہو تو وہ لوگوں کے لئے نصیحت اور اضافۂ ایمان کی کتاب نہ بن سکے گا۔ گہری نصیحت نئے نئے معانی کی دریافت کے ذریعہ ہوتی ہے نہ کہ کچھ معلوم اور محدود باتوں کی تکرار سے۔

یہ کوئی قیاسی بات نہیں۔ حدیث سے صراحۃً بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن میں نئے معانی کی دریافت کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق، رسول اللہؐ نے فرمایا "ولا تنقضی عجائبه" (الدارمی، فضائل القرآن، الترمذی، ثواب القرآن) یعنی قرآن کے عجائب کبھی ختم نہ ہوں گے۔ ایک اور روایت میں "لا تفنی" کا لفظ ہے۔ یعنی قرآن کے عجائب کبھی فنا نہ ہوں گے۔ اس حدیث میں عجائب سے مراد معنوی عجائب ہیں۔ یعنی قرآن کے معانی اتنے زیادہ ہیں کہ ہر دور کے علماء اس سے نئے نئے معانی دریافت کرتے رہیں گے۔ اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

تاریخ کے ہر دور میں قرآن کی آیتوں میں نئے نئے معانی کی دریافتوں کا سلسلہ جاری رہا ہے جس کو استنباط کہا جاتا ہے۔ اس کی مثالیں تفسیر کی ہر کتاب میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ موجودہ زمانہ میں بھی یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ مثال کے طور پر قرآن میں اعداد قوت کے حکم کے تحت جنگی گھوڑوں کی فراہمی کا حکم دیا گیا ہے (الانفال ۶۰)۔ موجودہ زمانہ میں جنگی گھوڑوں کی جگہ جنگی مشینوں نے لے لی ہے۔ چنانچہ تمام علماء اب اس آیت کی تفسیر کے تحت کہتے ہیں کہ حالات کی تبدیلی کی بنا پر اس آیت میں جنگی گھوڑوں کے بجائے جنگی مشینوں کی فراہمی مراد لی جائے گی۔ کیونکہ اب جنگی گھوڑوں کے ذریعہ ارہاب کا فائدہ حاصل نہیں کیا جاسکتا جس کو مذکورہ آیت میں اعداد قوت کا مقصود بتایا گیا ہے۔ اب ارہاب کا یہ فائدہ مشینی طاقت کے ساتھ وابستہ ہو گیا ہے۔

قرآن ہر دور میں مسلمانوں کے لئے ذہنی اور علمی ارتقاء کا ذریعہ رہا ہے۔ قرآن کی سب سے اہم صفت یہ ہے کہ وہ ذہن انسانی کو مہمیز کرتا ہے اور اس کو بار بار غور و فکر کے اوپر ابھارتا

ہے۔ قرآن اپنے لامحدود معانی کی بنا پر اہل اسلام کے لئے فکری ارتقاء کا ضامن ہے۔ ایسی کتاب میں نئی علمی دریافتوں کا دروازہ بند کرنا خود اس کتاب کے مقصد کی نفی کے ہم معنی ہے۔ ایسا کرنے کی صورت میں اہل اسلام ذہنی جمود کا شکار ہو جائیں گے۔ وہ نہ خود علمی ترقی کریں گے اور نہ انسانی قافلوں کی علمی و فکری قیادت کا مطلوب کام انجام دے سکیں گے۔

اصل یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ تفسیر جو تدبر کے ساتھ کی جائے اور دوسری تفسیر وہ ہے جو تدبر کے بغیر کی جائے۔ اسی دوسری تفسیر کا نام تفسیر بالرائے ہے۔ تدبر کے ساتھ تفسیر کا مطلب یہ ہے کہ قاری عربی زبان نیز احادیث و آثار سے بخوبی واقفیت حاصل کرے۔ وہ قرآن کی صرف ایک آیت کو لے کر اس کی تفسیر نہ کرنے لگے، بلکہ وہ مجموعی طور پر پورے قرآن کے منشاء مقصود کو سامنے رکھے۔ وہ قرآن سے متعلق دوسرے علوم سے گہری واقفیت حاصل کرے۔ اسی طرح وہ یہ کرے کہ دور اول سے لے کر بعد کے زمانہ تک مسلمہ دینی شخصیتوں نے جو تفسیریں کی ہیں ان سے وہ بھرپور واقفیت حاصل کرے۔ اسی کے ساتھ وہ تقویٰ کی صفت اپنے اندر پیدا کرے جس کو قرآن میں علم کا سرچشمہ بتایا گیا ہے۔ (البقرہ ۲۸۲)۔ یہ قرآن کی تفسیر کا صحیح طریقہ ہے۔

اس کے برعکس تفسیر بالرائے یہ ہے کہ آدمی صرف اپنی رائے پر اعتماد کرے۔ آیت کے حوالے سے اس کے ذہن میں جو بھی خیال آجائے وہ اس کو قرآن کی تفسیر سمجھ کر اسے بیان کرنے لگے۔ خواہ آیت کے سیاق و سباق سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ خواہ قرآن کے مجموعی احکام سے وہ مطابقت نہ رکھتا ہو۔ یہاں تفسیر بالرائے کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ تفسیر بالرائے کی ایک صورت وہ ہے جو اتنی قبیح ہے کہ اس کو سننے اور پڑھنے کے بعد فوراً ہی سنجیدہ آدمی کا ذہن اس کو رد کر دے۔ مثلاً قرآن کی ایک آیت یہ ہے "وربك فكبر" (المدثر ۳) اس آیت کا ترجمہ کچھ لوگوں نے یہ کیا کہ اور تم اپنے رب کو بڑا کرو، اس ترجمہ کو لے کر آیت کی تفسیر انہوں نے یہ کی کہ خدا کی (سیاسی بڑائی) دنیا میں قائم کرو، خدا کی حکومت کا جھنڈا

دنیا میں بلند کرو۔

یہ ترجمہ اور تفسیر دونوں تفسیر بالرائے کی ایک بدترین صورتیں ہے، عقلِ سلیم ہی اس کو غلط سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ اللہ اپنے آپ میں بڑا ہے۔ وہ اس کا محتاج نہیں کہ اس کی کوئی مخلوق کسی پہلو سے اس کو بڑا کرے۔ آیت کے مطابق، انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ اللہ کی عظمت کو اپنے دل اور دماغ میں اتارے۔ اللہ کی عظمت کا احساس اس کی روح کے اندر تیرنے لگے۔ اپنے چھوٹا ہونے اور اللہ کے بڑا ہونے کا عرفان اس کو انسان اصلی (man cut to size) بنادے۔ یہی تکبیر رب کا مطلب ہے۔

مذکورہ آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ـــــ اور اپنے رب کی بڑائی کرو، یا اپنے رب کی بڑائی بول، یا اپنے رب کی بڑائی بیان کر۔ اس ترجمہ کے مطابق، آیت میں جس تکبیر رب کا ذکر ہے اس کا تعلق کسی خارجی سیاست سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق آدمی کی اپنی داخلی کیفیت سے ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کا دماغ اللہ کی عظمت کو شعوری طور پر دریافت کرے۔ اس کا دل اللہ کی عظمت کے احساس سے تڑپ اٹھے۔ اللہ کی عظمت کا اعتراف اس کی زبان پر جاری ہو جائے۔ یہی وہ تکبیر رب ہے جس کا قرآن میں حکم دیا گیا ہے۔

۲۔ قرآن کے آغاز میں یہ آیت آئی ہے "ذلك الكتاب لا ريب فيه" (البقرہ ۲) یعنی یہ کتاب (الٰہی) ہے، اس میں کوئی شک نہیں، یا یہ کہ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ اس آیت کی نحوی ترکیب میں کچھ اختلاف ہے۔ تاہم ہر مفسر نے یہاں کتاب کو کتاب ہی کے معنی میں لیا ہے۔ اس کے بارے میں ایک صاحب نے لکھا ہے کہ وہ تمام ترجمے غلط ہیں جن میں "ذالك الكتاب" کا ترجمہ کتاب سے کیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک قرآن تمام علوم کا خزانہ ہے۔ اس لئے ذالک الکتاب کا سب سے قریبی ترجمہ یہ ہو سکتا ہے کہ یہ ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔

یہ ترجمہ یقینی طور پر رائے کی بنیاد پر کیا گیا ہے نہ کہ حقیقی علم کی بنیاد پر، اس لئے کہ انسائیکلوپیڈیا ایسی کتاب کا نام ہوتا ہے جس میں ہر قسم کی معلومات یکجا کی گئی ہوں۔ مگر قرآن

انسائیکلو پیڈیائی مفہوم میں معلومات کا مجموعہ نہیں۔ اس کے بجائے وہ علم اور معرفت کا مجموعہ ہے۔ وہ خزانۂ حکمت ضرور ہے مگر وہ معروف معنی میں، خزانۂ معلومات نہیں۔

مثال کے طور پر اسلام کا کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے، مگر قرآن میں یکجائی طور پر کہیں یہ کلمہ موجود نہیں۔ اسلام میں نماز پانچ وقتوں کے لئے فرض کی گئی ہے۔ مگر پانچ کے عددی تعین کے ساتھ قرآن میں نماز کا حکم موجود نہیں۔ انسائیکلوپیڈیا میں جن اشخاص کا ذکر آتا ہے، اس میں سال پیدائش اور سال وفات کے ساتھ ان کا ذکر آتا ہے۔ مگر قرآن میں پیغمبر اسلام نیز دوسرے پیغمبروں میں سے کسی بھی پیغمبر کی سال پیدائش یا سال وفات قرآن میں مذکور نہیں۔ اس طرح کی ہزاروں معلوماتی باتیں ہیں جن سے قرآن کے صفحات خالی ہیں۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں کتاب کا ترجمہ انسائیکلوپیڈیا کے لفظ سے کرنا ایک ذاتی اُپج ہے، اس کے حق میں کوئی علمی بنیاد موجود نہیں۔

۳۔ قرآن میں ایک حکم وہ ہے جو "اقیموا الدین" (الشوریٰ ۱۳) کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ اس آیت کا سادہ ترجمہ یہ ہے کہ تم الدین کو قائم کرو۔ کچھ لوگوں نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس آیت میں الدین سے مراد قرآن و حدیث میں وارد شدہ تمام شرعی اور دینی احکام ہیں۔ اور اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ان تمام شرعی اور دینی احکام کو ایک مکمل نظام کے طور پر دنیا میں نافذ کرو۔

آیت کی یہ تفسیر بلاشبہہ تفسیر بالرائے کے حکم میں آتی ہے کیوں کہ وہ قرآن فہمی کے واضح اصولوں کے خلاف ہے۔ مثال کے طور پر، اس آیت میں صراحۃً اس حصۂ دین کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے جو حضرت نوح کو اور حضرت ابراہیم کو اور حضرت موسیٰ کو اور حضرت عیسیٰ کو اور حضرت محمد کو مشترک طور پر دیا گیا۔ اس مخصوص انداز بیان کی بنا پر تمام مفسرین نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ یہاں الدین سے مراد صرف دین کی اساسی تعلیمات ہیں کیوں کہ مختلف پیغمبروں کا مشترک دین یہی اساسی تعلیمات تھیں۔ جہاں تک تفصیلی شرائع کا تعلق ہے وہ نص

قرآنی (المائدہ ۴۸) کے مطابق مختلف پیغمبروں کے یہاں مختلف تھیں۔

اس آیت میں جو حکم دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ الدین کو قائم کرو اور اس میں متفرق نہ ہو (الشوریٰ ۱۳) چونکہ دین کی مشترک پیروی صرف اساسی دینی تعلیمات ہی میں ہو سکتی ہے اس لئے یہاں صرف اساسی دینی تعلیمات کو اقامت کے تحت سمجھا جائے گا۔ تمام شرائع کو اس کے تحت لینے کی صورت میں تفرق لازم آئے گا، یعنی وہی چیز جس سے آیت میں منع کیا گیا ہے۔

تفسیر بذریعہ تدبّر

عام طور پر تفسیر کی دو قسمیں سمجھی جاتی ہیں۔ تفسیر ماثور، اور تفسیر بالرائے۔ مگر تفسیر کی ایک اور قسم ہے جس کو تفسیر بذریعہ تدبر کہا جا سکتا ہے۔ احادیث و آثار اور اقوال سلف کی روشنی میں قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرنا، بلاشبہہ بہت اہم اور ضروری ہے۔ مگر قرآن کے عجائب کو مزید دریافت کرنے کے لئے ہر دور میں اس پر غور و تدبر کا سلسلہ جاری رہے گا۔ جائز دائرے میں اس کا سلسلہ کبھی بند نہیں ہوگا۔ یہاں قرآن سے ایک مثال دی جاتی ہے جس سے یہ معاملہ مزید واضح ہو جاتا ہے۔

قرآن کی سورہ نمبر ۱۲ میں حضرت یوسف کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت یوسف کو مصر کے ارضی خزائن پر حاکم مقرر کیا گیا۔ قحط کے زمانہ میں ان کے خصوصی انتظام کے تحت لوگوں کو غلّہ فراہم کیا جانے لگا۔ اسی زمانہ میں غلّہ لینے کے لئے ان کے بھائی کنعان سے مصر آئے۔ اور غلہ حاصل کر کے روانہ ہوئے۔ پھر یہ واقعہ ہوا کہ دربار کے کارکنوں نے حضرت یوسف کے چھوٹے بھائی بن یامین کے اونٹ پر لدے ہوئے غلّہ سے ایک شاہی سامان برآمد کیا۔ اس کے بعد بن یامین کو چوری کے الزام میں ماخوذ کر کے حضرت یوسف کے حوالے کر دیا گیا۔

یہاں قرآنی آیتوں کی تفسیر عام طور پر یہ کی جاتی ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائی بن یامین کو پہچان کر انہیں اپنے پاس روکنا چاہا مگر چونکہ وہ اپنی شخصیت کو ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے یہ تدبیر کی کہ جب بھائیوں کو غلہ دیا جانے لگا تو ان کے حکم سے ایک شاہی سامان

(سقایہ) بن یامین کے سامان میں رکھ دیا گیا پھر جب وہ لوگ اپنا غلہ لے کر جانے لگے تو نعوذ باللہ حضرت یوسفؑ نے یہ کیا کہ قافلے کو روک کر ان کے سامان کی تلاشی کروائی۔ پھر جب منصوبہ کے مطابق، شاہی سقایہ بن یامین کے سامان سے نکل آیا تو انہوں نے بن یامین کو نعوذ باللہ چور قرار دے کر اپنے پاس روک لیا اور بقیہ بھائیوں سے کہا کہ تم لوگ واپس جاؤ۔

یہ تفسیر واضح طور پر ایک پیغمبر کے اخلاق کو داغدار کرتی ہے۔ مگر جب قرآن کی متعلق آیتوں کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ تفسیر کے علاوہ یہاں ایک اور زیادہ صحیح تفسیر موجود ہے۔ اس دوسری تفسیر میں حضرت یوسفؑ مکمل طور پر بری الذمہ قرار پاتے ہیں۔

یہ دوسری تفسیر سورۃ یوسف (رکوع ۹ آیت ۷۰۔۷۶) کے گہرے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہے۔ ان آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ حضرت یوسف نے جب ان کا سامان سفر درست کیا تو اپنے بھائی بن یامین کے سامان میں اپنا سقایہ (پینے کا پیالہ) رکھ دیا پھر جب بھائیوں کا یہ قافلہ روانہ ہوا تو درباریوں کو کسی وجہ سے اپنا صواع (ناپنے کا پیمانہ) دکھائی نہیں دیا۔ چنانچہ انہوں نے قافلہ والوں کو پکار کر روکا اور کہا کہ ہم کو شبہہ ہے کہ تم نے ہمارا (چاندی کا) صواع چرا لیا ہے۔ چنانچہ قافلہ کو روک کر ان کے سامان کی تلاشی لی گئی۔ آخر کار حضرت یوسفؑ کے بھائی بن یامین کے سامان سے وہ برآمد ہو گیا۔ پھر کنعان کے قانون کے مطابق بن یامین کو پکڑ کر حضرت یوسفؑ کے حوالے کر دیا گیا۔ اس طرح حضرت یوسف کو اپنا وہ بھائی مل گیا جس کو وہ اپنے پاس روک لینا چاہتے تھے۔

ان آیتوں کے الفاظ پر غور کیجئے تو ایک بہت بامعنی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ وہ حقیقت عربی قاعدہ کے مطابق، ضمیر کے فرق میں چھپی ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائی کے سامان میں جو چیز رکھی وہ سقایہ (۷۰) تھا۔ یعنی ایک ایسی چیز جو عربی قاعدے کے مطابق، مونث ہے مگر دربار کے کارکنوں نے قافلے والوں کی تلاشی کے بعد ان کے سامان میں سے جو چیز برآمد کی اس کو قرآن میں ضمیر مذکر کے بجائے ضمیر مؤنث (ثم استخرجھا) کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی ضمیر 'ہ' کی بجائے 'ھا'۔

ضمیر کے اس فرق پر غور کرنے سے معاملہ کی جو صورت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف نے اپنے بھائی کے سامان میں برادرانہ محبت کے تحت زادراہ کے ساتھ اپنا پانی پینے کا پیالہ بھی رکھ دیا تھا۔ درباری کارکن اس سے باخبر نہ تھے۔ البتہ اس دوران دربار کی ایک اور زیادہ بڑی چیز، صواع (غلہ ناپنے کا پیمانہ) سامانوں میں دب کر بظاہر گم ہو گیا۔ جلدی میں درباری کارکنوں کا دھیان قافلے والوں کی طرف گیا اور انہوں نے ان پر شبہ کرتے ہوئے انہیں روکا اور ان کے سامان کی تلاشی لی۔ اس تلاشی کے دوران ان کا مطلوب پیمانہ 'صواع' تو نہیں ملا البتہ اس دربار کی ایک اور چیز، پانی پینے کا پیالہ (سقایۃ) بن یامین کے سامان سے برآمد ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے بن یامین کو خود برادرانِ یوسفؑ کی شریعت کے مطابق روک لیا۔

یہ سارا معاملہ حضرت یوسفؑ کے کسی حکم کے بغیر درباریوں نے بطور خود کیا۔ اسی لئے اس واقعہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "اس طرح ہم نے یوسفؑ کے لئے تدبیر کی، وہ بادشاہ کے قانون کے رو سے اپنے بھائی کو نہیں لے سکتا تھا۔ مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ ہم جس کے درجے چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں۔ اور ہر علم والے سے بالاتر ایک علم والا ہے۔ (یوسف ۷۶) یہ تفسیر قرآنی الفاظ کے مطابق بھی ہے اور حضرت یوسف کی پیغمبرانہ عظمت کے مطابق بھی۔

قرآن میں اہل ایمان کو حکم دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ : **واعدوا لهم مااستطعتم من قوة و من رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدو كم و آخرين من دونهم لا تعلمونهم الله يعلمهم** (الانفال ۶۰) یعنی اور ان کے لیے جس قدر تم سے ہو سکے تیار رکھو قوت اور پلے ہوئے گھوڑے کہ اس سے تمہاری ہیبت رہے اللہ کے دشمنوں پر اور تمہارے دشمنوں پر اور ان کے علاوہ دوسرے پر بھی جن کو تم نہیں جانتے۔ اللہ ان کو جانتا ہے۔

موجودہ زمانہ کے ایک عرب مفسر قرآن نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اعداد قوت کا مقصد تحریر الانسان ہے۔ اہل ایمان کو طاقت کی فراہمی کا حکم اس لیے دیا گیا تاکہ

وہ ساری دنیا کے انسانوں کو ہر قسم کی غلامی سے آزاد کرائیں۔ مثلاً کمیونزم، نازی ازم، سیکولرزم اور زائنزم (صیہونیت)، وغیرہ کی غلامی سے نجات دلانا۔

آیت کی یہ تفسیر بظاہر ایک انقلابی تفسیر معلوم ہوتی ہے۔ مگر یقینی طور پر وہ تفسیر بالرائے ہے۔ مفسر نے قرآن کے الفاظ پر غور کیے بغیر اپنے ذہن میں موجود خیالات کو آیت کی تفسیر میں شامل کر دیا۔ آیت کے الفاظ پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس کے مطابق، اعداد قوت کا مقصد ارہاب عدو ہے یعنی دشمن کو ہیبت زدہ رکھنا تاکہ وہ اہل ایمان کے خلاف جارحیت کا حوصلہ نہ کر سکے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ آیت میں اعداد قوت کا حکم دفاعی مقصد کے تحت دیا گیا ہے، مگر مذکورہ مفسر نے اس کو اقدامی معنی میں لے لیا۔

ایک خط

برادر محترم جناب جسٹس قاضی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ

۱۹ مارچ ۲۰۰۱ء کو آپ سے ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی۔ موجودہ امت مسلمہ کے بارے میں آپ سے جو بات ہوئی تھی اس کی کچھ تفصیل یہاں درج کر رہا ہوں امید کہ غور فرمائیں گے۔

ابن خلدون (وفات ۸۰۸ھ) نے لکھا ہے کہ جس طرح اشخاص کی ایک عمر ہوتی ہے اسی طرح ملتوں کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ کوئی ملت تین نسل تک عروج پر رہتی ہے اس کے بعد اس پر زوال آنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ ایک اٹل قانون ہے (مقدمہ ابن خلدون ۱۷۰۔۱۷۱)

یہ ایک حقیقت ہے کہ جوانی کے بعد بڑھاپا آتا ہے۔ قومیں عروج کے بعد زوال کا شکار ہوتی ہیں۔ یہ فطرت کا ایک عمومی قانون ہے۔ مگر اس عموم میں استثناء ممکن ہے۔ اس معاملہ کا ذکر قرآن میں اس طرح آیا ہے کہ: کیا ایمان والوں کے لئے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی نصیحت کے آگے جھک جائیں۔ اور اس حق کے آگے جو نازل ہو چکا ہے۔ اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی۔ پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے۔ اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں۔ جان لو کہ اللہ زمین کو زندہ کرتا ہے اس کی موت کے بعد، ہم نے تمہارے لئے نشانیاں بیان کر دی ہیں، تاکہ تم سمجھو (الحدید ۱۶۔۱۷)

اس قرآنی بیان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طول اُمد کے نتیجہ میں ہمیشہ قساوت پیدا ہوتی ہے، یعنی امت کی ابتدائی نسل زندہ شعور کے ساتھ مومن بنتی ہے اس لئے اس کا ایمان قوی ہوتا ہے۔ لیکن بعد کے لوگ محض نسلی تعلق کی بنا پر مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں اس لئے ان کے ایمان میں ضعف آجاتا ہے۔ اسی ضعف کا نتیجہ زوال ہے۔ اس ضعف کی حالت کو دوبارہ قوت کی حالت میں کیسے بدلا جائے، اس کا جواب زمین کی مثال میں دیا گیا ہے۔

زمین بھی اسی طرح بنجر ہو جاتی ہے۔ مگر جب اس میں دوبارہ کسانی عمل کیا جائے تو وہ زرخیز ہو کر عمدہ فصل دینے کے قابل ہو جاتی ہے۔ یہی عمل زوال کے زمانہ میں امت کے افراد پر کرنا ہے۔ وہ یہ کہ تذکیر و تعلیم کے ذریعہ ان کے اندر دوبارہ خشوع کی کیفیت پیدا کی جائے۔ دوسرے لفظوں میں، شعورِ ایمان پیدا کرنے کا وہی عمل جو ابتدائی لوگوں پر کیا گیا تھا اور جس کے نتیجہ میں وہ باشعور مومن بن کر امت میں داخل ہوئے تھے۔

امت مسلمہ اب زوال کا شکار ہو چکی ہے، اس کا اعتراف اکثر رہنماؤں نے کیا ہے۔ مثلاً اقبال نے اپنے زمانہ کے مسلمانوں کے بارے میں اپنا تجربہ اس طرح بیان کیا تھا:

تیرے محیط میں کہیں جوہرِ زندگی نہیں دیکھ چکا میں موج موج ڈھونڈ چکا صدف صدف

اقبال کا کلام گویا مردہ امت میں دوبارہ زندگی لانے کی ایک کوشش تھی۔ مگر اقبال کی ساری کوشش عملاً بے نتیجہ رہی، اس کا سبب یہ ہے کہ ان کی تشخیص تو درست تھی مگر ان کی تجویز سراسر غلط۔ انہوں نے مسلمانوں کے زوال کو ختم کرنے کے لئے جو علاج دریافت کیا وہ ان کے الفاظ میں بانگ درا اور ضربِ کلیم تھا۔ چنانچہ انہوں نے کہا:

نوا را تلخ ترمی زن چو ذوق نغمہ کم یابی حدی را تیز ترمی خواں چو محمل را گراں بینی

اقبال کی طرح دوسرے بہت سے رہنماؤں نے اس حقیقت کو دریافت کیا کہ امت زوال کا شکار ہو چکی ہے۔ اس دریافت کے بعد انہوں نے احیاء امت کے لئے بڑی بڑی تحریکیں چلائیں۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی اس قسم کی سرگرمیوں سے بھری ہوی ہے۔ مگر تقریباً یہ تمام سرگرمیاں بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔ ہر ایک کے ساتھ مشترک طور پر یہ حادثہ پیش آیا کہ تشخیص کی حد تک وہ درست تھے مگر تجویز یا مرض کے علاج کے بارے میں سراسر غلط۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان اب اپنے زوال کے آخری دور میں پہنچ چکے ہیں۔ قرآن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح بنجر زمین کو دوبارہ سرسبز زمین بنایا جاسکتا ہے اسی طرح زوال یافتہ امت کو بھی دوبارہ زندہ کیا جاسکتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس کے اوپر اصلاح کا درست عمل جاری کیا جائے اور امت اس اصلاحی عمل کو قبول کرلے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی امت کو دوبارہ زندہ کرنے کا یہ عمل اس کے افراد میں معرفت کا شعور پیدا کرنے سے ہوگا نہ کہ کلمہ کا تلفظ درست کرنے سے۔ یہ مقصد نماز کو خشوع کا عمل بنانے سے حاصل ہوگا نہ کہ فضائل کی طلسماتی کہانیاں سنا کر مسجدوں کی بھیڑ میں اضافہ کرنے سے۔ اس کا آغاز لوگوں میں عجز خداوندی کی روح جگانے سے ہوگا نہ کہ ان کے اندر قومی فخر کا جذبہ ابھارنے سے۔ یہ کام ملت کے اندر محاسبۂ خویش کا مزاج پیدا کرنے سے ہوگا نہ کہ خارجی سازشوں کا انکشاف کرنے سے۔ یہ کام افراد کی تعلیم و تربیت سے شروع ہوگا نہ کہ زمین پر قبضہ کر کے فوجداری قوانین نافذ کرنے سے۔ یہ کام لوگوں کے اندر صبر کی صفت پیدا کرنے سے ہوگا نہ کہ لوگوں کو ٹکراؤ کے میدان میں سرگرم کرنے سے۔ یہ مقصد لوگوں کے اندر ہوش پیدا کر کے حاصل ہوگا نہ کہ رجز خوانی کے ذریعہ جوش ابھارنے سے۔ ملت کے احیاء نو کے لئے جو چیز مطلوب ہے وہ اس کے اندر روحانی بیداری ہے نہ کہ سیاسی ہنگاموں کا جنگل اگانا۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں قیادت کا فقدان ہے۔ مگر یہ بات درست نہیں۔ موجودہ مسلمانوں میں جو کمی ہے وہ فقدانِ قیادت کی نہیں ہے بلکہ فقدانِ قبولیتِ قیادت کی ہے۔ کسی قوم کا احیاء نو بلاشبہہ ممکن ہے مگر اس کا انحصار اس پر ہے کہ وہ قوم اصلاحی کوشش کو قبول کرتی ہے یا نہیں۔ یہاں میں اس سلسلہ کی ایک معاصر مثال پیش کروں گا۔

روس اور چین دونوں کمیونسٹ ملک تھے مگر روس کا نظام تباہی کا شکار ہو گیا۔ اس کے برعکس چین کا نظام بدستور چلا جارہا ہے۔ اس فرق کا سبب یہ ہے کہ چین میں ایک مدبّر قائد (Teng hsiao-Ping) اٹھا۔ وہ ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوا۔ اس کی تعلیم فرانس میں ہوئی۔ اس نے گہرے مطالعہ کے ذریعہ کنٹرولڈ اکانومی کے مقابلے میں لبرل اکانومی کی اہمیت کو سمجھا۔ وہ چینی کمیونسٹ پارٹی کا لیڈر تھا۔ اس نے یہ نظریہ قائم کیا کہ سیاست پر کمیونسٹ پارٹی کا کنٹرول باقی رکھتے ہوئے ملک میں اقتصادی سرگرمیوں کو آزاد کر دیا جائے۔ لمبی مخالفت کے بعد وہ اس میں کامیاب ہوا۔ سیاست اور اقتصادیات کے درمیان تفریق (۱۹۷۴-۱۹۷۹) کا یہ نتیجہ ہے کہ چین زوال کا

شکار ہونے کے بعد دوبارہ سنبھل گیا۔ روس میں بھی کچھ ایسے مفکر پیدا ہوئے مگر روسی کمیونسٹ پارٹی ان کو قبول نہ کر سکی نتیجہ یہ ہوا کہ روس کا نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر رہ گیا۔

قانون فطرت کے مطابق موجودہ مسلمانوں کا احیاء نو اتنا ہی ممکن تھا جتنا کہ بنجر زمین کا دوبارہ زندہ ہونا۔ مگر موجودہ زمانہ کے غیر دانشمند مصلحین اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ بن گئے۔ ان لوگوں نے اپنی غلط کوششوں سے مسلمانوں کے مزاج کو اس طرح بگاڑ دیا کہ وہ صحیح رہنمائی کو قبول کرنے کے قابل ہی نہ رہے۔ ان کا وہ حال ہو گیا جس کی تصویر قرآن میں اس طرح بتائی گئی ہے کہ: اور اگر وہ ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو نہ اپنائیں گے اور اگر وہ گم راہی کا راستہ دیکھیں تو وہ اس کو اپنا لیں گے (الاعراف ۱۴۶)

اسی مزاجی بگاڑ کا یہ نتیجہ ہے کہ اب انہیں وہی باتیں اپیل کرتی ہیں جو ہائی پروفائل میں کہی گئی ہوں۔ جب کہ اس دنیا میں حقیقی مصلح وہ ہے جو لو پروفائل میں کلام کرے۔ ان مسلمانوں کو ٹکراؤ کی زبان اچھی معلوم ہوتی ہے جب کہ اچھی زبان وہ ہے جو نرمی اور امن کی زبان ہو۔ ان کو اغیار کے خلاف احتجاج کرنا کام نظر آتا ہے جب کہ کام یہ ہے کہ خود اپنی کمیوں کو تلاش کر کے ان کو درست کیا جائے۔ ان کو بڑے بڑے خیالی منصوبے اہم دکھائی دیتے ہیں، حالاں کہ اہم منصوبہ وہ ہے جو ٹھوس حقائق کی بنیاد پر بنایا گیا ہو۔ وہ ان لوگوں کو اپنا ہمدرد سمجھتے ہیں جو انہیں خوش کرنے والی بولی بولیں، حالانکہ سچا ہمدرد وہ ہے جو نصیحت کی زبان میں کلام کرے۔

یہی مزاجی بگاڑ موجودہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں اٹھنے والی تمام تحریکوں نے صرف مسلمانوں کے مزاج کو بگاڑنے کا کام کیا ہے۔ یہی وہ خاص وجہ ہے جس کی بنا پر اب مسلمانوں کا یہ حال ہو گیا کہ بے دانش رہنما ان کے درمیان قبولیت پاتے ہیں اور دانشمند رہنما ان کے درمیان ناقابل قبول بن کر رہ جاتے ہیں۔ اسی صورت حال کا یہ نتیجہ ہے کہ موجودہ مسلمانوں میں احیاء نو کا کوئی حقیقی عمل ابھی تک جاری نہ ہو سکا۔

نئی دہلی، ۲۱ مارچ ۲۰۰۱ء　　دعاگو　　وحید الدین

ایک خط

برادر محترم عبدالسلام اکبانی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ

۵ فروری ۲۰۰۱ کو آپ سے ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی۔ آپ نے اس مہلک حالیہ زلزلہ کا ذکر کیا جو ۲۶ جنوری ۲۰۰۱ کو گجرات میں آیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں تقریباً ایک لاکھ آدمی مر گئے اور کھربوں روپیہ کا نقصان ہوا۔

اس معاملہ میں سب سے زیادہ عجیب ردّ عمل مسلمانوں کی طرف سے سامنے آیا ہے۔ اکثر مسلمان یہ کہتے ہوئے سنائی دئے کہ یہ خدا کا قہر ہے جو بابری مسجد توڑنے والوں کے اوپر ظاہر ہوا۔ یہ طرز فکر یقینی طور پر غیر اسلامی ہے۔ خدائی قہر کا اعلان ہمیشہ خود خدا کی طرف سے کیا جاتا ہے نہ کہ کسی انسان کی طرف سے۔ اس سلسلہ میں میں یہاں دو باتیں عرض کروں گا۔

پہلی بات یہ کہ اس قسم کی آفات کو خدا کا قہر کہنا بنیادی طور پر غلط ہے۔ قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ زمینی یا آسمانی آفات کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کو عذاب کہا گیا ہے۔ اور دوسری وہ جس کو انتباہ (warning) کہا جاتا ہے۔ عذاب کا تعلق اللہ کی ایک خاص سنت سے ہے۔ کسی قوم پر عذاب صرف اس وقت آتا ہے جب کہ وہ اتمام حجت کے باوجود، پیغمبر کی دعوت کو ماننے سے انکار کر دے۔ اس کے بعد اس کو پیغمبر کی طرف سے وارننگ دی جاتی ہے۔ اس وارننگ کے باوجود جب وہ قوم اپنا رویہ نہیں بدلتی تو اس پر خدا کا عذاب نازل ہوتا ہے۔ اسی کا دوسرا نام قہر الٰہی ہے۔ دوسری صورت وہ ہے جب کہ تنبیہ کے طور پر کسی کو کسی مصیبت میں مبتلا کیا جائے۔ یہ معاملہ فرد کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے اور قوم کے ساتھ بھی۔ نیز وہ مسلمانوں کے ساتھ بھی اسی طرح پیش آسکتا ہے جس طرح وہ غیر مسلموں کے ساتھ پیش آتا ہے۔ تنبیہی آفت میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان کوئی تفریق نہیں۔

اس معاملہ کا دوسرا اہم تر پہلو یہ ہے کہ کسی آفت کو دیکھ کر اہل ایمان کے اندر کیا رد عمل ہونا چاہئے۔ یہ رد عمل سراسر غیر مومنانہ ہے کہ کوئی شخص کسی آفت کو دیکھ کر خوش ہو اور یہ کہے کہ یہ فلاں لوگوں کے اوپر قہر الٰہی ہے۔ اس قسم کے الفاظ بولنے کا حق کسی بھی انسان کو نہیں۔ اگر فی الواقع کوئی آفت قہر الٰہی ہو تب بھی اس کا اعلان صرف خدا کر سکتا ہے۔ آدمی کو سرے سے ایسا اعلان کرنے کا حق ہی نہیں۔ مزید یہ کہ خدا کی طرف سے اس قسم کا شخص اعلان پیغمبر کے زمانہ میں ہو سکتا تھا اب جب کہ کوئی پیغمبر آنے والا نہیں اس لئے ایسا اعلان بھی خدا کی طرف سے ہونے والا نہیں۔

دوسری بات یہ کہ کسی بھی آفت یا مصیبت کو دیکھ کر متقی انسان خود اپنے بارے میں کانپ اٹھتا ہے۔ مخلص انسان آفت یا مصیبت کو دیکھ کر ہمیشہ اپنے بارے میں فکر مند ہو جاتا ہے۔ آفت یا مصیبت کو دیکھ کر اس کو دوسرے کی چیز سمجھ لینا ایک بے حسی کی روش ہے۔ ایسا احساس صرف کسی ایسے سینہ میں پرورش پا سکتا ہے جو اللہ کے ڈر سے خالی ہو۔

سچا مومن دوسرے کی موت کو دیکھ کر اپنی موت کو یاد کرتا ہے۔ وہ دوسرے کے اوپر آنے والی مصیبت کو دیکھ کر اپنے لئے پناہ مانگنے لگتا ہے، حتی کہ ایک مومن کا گزر اگر کسی ہلاک شدہ قوم کی بستیوں سے ہو تب بھی اس کا دل پکار کر کہہ اٹھتا ہے کہ اے اللہ، ہم کو ایسے انجام سے بچا۔

اس کے علاوہ خود انسانی نقطۂ نظر سے بھی یہ ایک غیر انسانی روش ہے کہ کوئی شخص دوسروں کی ہلاکت پر خوش ہو اور ان کے بارے میں غیر ہمدردانہ قسم کے ریمارک دے۔ ایک انسان جس کی فطرت زندہ ہو وہ اپنے دشمن کو بھی تکلیف کی حالت میں دیکھ کر تڑپ اٹھے گا، وہ غیروں کو بھی مصیبت میں دیکھے گا تو اس کے لئے ناممکن ہو جائے گا کہ ان کے خلاف کوئی غیر ہمدردانہ کلمہ بولے۔

واضح ہو کہ آفات کی دو قسمیں جو میں نے عرض کیں ان میں ہر ایک کی نوعیت دوسرے سے مختلف ہے۔ تنبیہی آفت اس بات کی وارننگ ہوتی ہے کہ آدمی اپنی اصلاح کرے۔ اس کے برعکس عذاب یا قہر ہلاکت کے لئے ہوتا ہے، یعنی اس لئے کہ ان لوگوں سے

زندگی کا حق چھین لیا جائے۔

مثلاً گجرات کے واقعہ میں وارننگ کا پہلو نمایاں ہے۔ جیسا کہ رپورٹوں سے واضح ہوتا ہے، گجرات میں غیر معمولی تباہی کا سبب یہ تھا کہ پچھلے برسوں میں وہاں کثرت سے ایسے مکانات بنائے گئے جن کو non-engineered construction کہا جاتا ہے، جب کہ موجودہ زمانہ میں ثابت شدہ طریقہ یہ ہے کہ جس مقام میں معلوم طور پر زلزلہ آنے کا امکان ہو وہاں quake resistant مکان بنائے جائیں۔ اس طرح گجرات کی آفت کے ذریعہ قدرت کی طرف سے گویا یہ پیغام دیا گیا ہے کہ لوگ اپنے مکانات فن تعمیر کے اصول کے مطابق بنائیں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کچا مکان اگر بارش کی زد میں آکر گر جائے تو وہ اس بات کا فطری پیغام ہوتا ہے کہ آئندہ وہاں پختہ قسم کا مکان بنایا جائے جو بارش کے باوجود نقصان سے محفوظ رہے۔

آخری بات یہ کہ مومن وہ ہے جو ہر چیز سے ذاتی نصیحت لے۔ مثال کے طور پر ایک مسلمان کسی بستی میں ہے۔ وہاں طوفان آتا ہے جس میں دوسروں کے کچھ مکان گر پڑتے ہیں مگر مسلمان کا مکان محفوظ رہتا ہے۔ ایسی حالت میں مسلمان اگر خوش ہو کر کہے کہ دیکھو، یہ لوگ بہت بُرے تھے، اس لئے اللہ نے ان کے مکانوں کو ڈھا دیا تو یہ بلاشبہہ ایک غیر مومنانہ قول ہوگا۔ ایسے موقع پر مومنانہ نفسیات یہ ہے کہ دوسروں کے بارے میں اس کے اندر ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو اور اپنے بارے میں شکر کا۔ وہ کہے کہ خدایا، تیرا شکر ہے کہ تو نے اس موقع پر مجھ کو آفت سے بچا لیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک بار سورج گرہن پڑا۔ اس کے بعد آپ نے اہل ایمان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ جب تم اس قسم کی کوئی چیز دیکھو تو تم ڈر کر اللہ کا ذکر کرنے لگو اور دعا کرنے لگو اور استغفار کرنے لگو۔ (مشکاۃ المصابیح ۱/۴۶۸) یہی ایسے مواقع پر مومنانہ قلب کی طرف سے صحیح جواب (response) ہے۔

۳۱ مارچ، ۲۰۰۱ — دعاگو — وحید الدین

خبر نامہ اسلامی مرکز ۱۵۲

۱ صدر اسلامی مرکز نے ۱۹۔۲۰ فروری ۲۰۰۱ کو حیدر آباد کا سفر کیا۔ وہاں علماء اور طلبہ اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کے درمیان چند خطابات ہوئے۔ ان میں اسلام کے دعوتی پہلو پر زور دیا گیا۔ اس کے علاوہ مختصر مجالس میں اسلام اور ملت مسلمہ کے موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا۔

۲ انڈیا انٹر نیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں ۲۱ فروری ۲۰۰۱ کو ایک سمینار ہوا۔ یہ التجارہ میگزین کی طرف سے منعقد کیا گیا تھا۔ تعلیم یافتہ مسلمان نیز ہندو اس میں شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی۔ اور سیرت رسول کے موضوع پر ایک تقریر کی۔

۳ وائی ایم سی اے کے انٹر نیشنل کانفرنس سنٹر (نئی دہلی) میں ۲۴ فروری ۲۰۰۱ کو مختلف مذاہب کا ایک سمینار ہوا۔ اس کا موضوع تھا 'مذہب اور روحانیت'۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور اسلام میں روحانیت کے موضوع پر تقریر کی۔ ایک سوال یہ تھا کہ آپ کو جو روحانیت ملی وہ کیا اسلامی تصوف کی دین ہے۔ جواب میں کہا گیا کہ روحانیت کا اصل سر چشمہ خدا کا عقیدہ ہے۔ جب ایک آدمی کو خدا کی دریافت ہوتی ہے تو اس کو ہر لمحہ اپنے آس پاس خدا کی موجودگی (presence of God) کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اپنے پاس خدا کی موجودگی کا یہی یقین روحانیت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

۴ صدر اسلامی مرکز نے یکم مارچ ۲۰۰۱ کو حیدر آباد کا سفر کیا۔ وہاں ان کے چند پروگرام ہوئے۔ ایک عمومی خطاب منالی گیسٹ ہاؤس میں ۲ مارچ کی شام کو ہوا۔ ان اجتماعات میں اسلام کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی گئی۔ شہر کے تعلیم یافتہ لوگ اس میں شریک ہوئے۔

۵ ای نیڈو ٹیلی ویژن (Eenedu Televišion) کے نمائندہ کرتک مہتا نے ۴ مارچ ۲۰۰۱

کو صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر افغانستان میں بدھا کے مجسموں کو توڑنے سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ افغانی طالبان کا یہ عمل سراسر اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔ مگر اس سے اسلام کو کوئی نقصان نہیں۔ اس لئے کہ اس قسم کی سرگرمیوں سے اسلام نیوز میں آتا ہے۔ اور اہل اسلام کو موقع ملتا ہے کہ وہ اسلام کی حقیقی تعلیمات کو میڈیا کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچا سکیں۔

۶ ہندی اخبار راشٹریہ سہارا (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر دود ساجد نے ۴ مارچ ۲۰۰۱ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق دو مسئلوں سے تھا۔ سماجی امن اور یکجہتی کے لئے اسلام کی رہنمائی کیا ہے۔ افغانستان میں بدھا کے مجسموں کو توڑنے کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے۔ دونوں سوالات کے بارہ میں اسلام کا نقطۂ نظر تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا۔

۷ زی نیوز (نئی دہلی) نے ۴ مارچ ۲۰۰۱ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ان کا سوال افغانستان میں طالبان کی بدھا کے مجسموں کو توڑنے کی کارروائی کے بارہ میں تھا۔ بتایا گیا کہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ افغانستان میں صحابہ کے زمانہ میں اسلام آیا۔ اس طرح صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور دوسرے علماء اسلام کے ذریعہ افغانستان میں اسلام پھیلتا رہا۔ یہ مجسمے ظہور اسلام کے پانچ سو سال پہلے سے افغانستان میں موجود ہیں۔

۸ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی (اردو مجلس) کے تحت ۵ مارچ ۲۰۰۱ کو ایک پینل ڈسکشن تھا جس میں صدر اسلامی مرکز سمیت چار افراد شریک ہوئے۔ ڈسکشن کا موضوع افغانستان میں طالبان کے بدھا کے مجسموں کو توڑنا تھا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر اسلام کا نقطۂ نظر پیش کیا۔ اس ڈسکشن کے کوآرڈی نیٹر پروفیسر اختر الواسع تھے۔

۹ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی کی انگریزی سروس کے تحت ۵ مارچ ۲۰۰۱ء کو افغانستان کے موجودہ بحران پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا گیا۔ اس انٹرویو میں بتایا گیا کہ گوتم بدھ کے

مجسمہ کو توڑنے کی جو مہم افغانستان میں جاری کی گئی ہے وہ سراسر اسلام کے خلاف ہے۔ اسلام کا نشانہ پتھر کے بتوں کو توڑنا نہیں ہے بلکہ انسان کے قلب وذہن کی اصلاح کرنا ہے اور انہیں ایک اللہ کا پرستار بنانا ہے۔ یہ مقصد ترغیب (persuasion) کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے نہ کہ توڑ پھوڑ کے ذریعہ۔

۱۰ ۶ مارچ ۲۰۰۱ کو انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (نئی دہلی) کے زیر اہتمام انٹرنٹ پر سوال و جواب کا پروگرام ہوا۔ اس کا پہلے سے اعلان کر دیا گیا تھا کہ ۶ مارچ کی شام کو صدر اسلامی مرکز سوال کا جواب دینے کے لئے ٹائمس آف انڈیا کے دفتر میں موجود رہیں گے۔ فوراً سوال اور اسی وقت جواب کا پروگرام دو کمپیوٹروں کے ذریعہ منظم کیا گیا۔ اخبار والوں نے بتایا کہ یہ ایک ریکارڈ ہے کہ صرف ایک شخص سے سوال کرنے کے لئے ایک وقت میں آٹھ سو سوالات آئے۔ ان سوالات کا فوری جواب انٹرنیٹ پر دیا گیا۔ فوری طور پر کچھ تاثرات بھی آئے۔

۱۱ ہندی روزنامہ دینک جاگرن (نئی دہلی) کے نمائندہ نے ۶ مارچ ۲۰۰۱ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ طالبان نے افغانستان میں گوتم بدھ کے جو مجسمے توڑے ان کا اسلامی حکم کیا ہے۔ بتایا گیا کہ یہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اسلام میں پرامن دعوت ہے نہ کہ متشددانہ توڑ پھوڑ۔

۱۲ اسٹار پلس ٹی وی کے نمائندہ مسٹر ترویدی نے ۷ مارچ ۲۰۰۱ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ایک سوال یہ تھا کہ طالبان کا مورتیوں کو توڑنا کیا بابری مسجد کے توڑنے کا ری ایکشن ہے۔ جواب میں کہا گیا کہ طالبان کے معاملہ کو بابری مسجد سے جوڑنا درست نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ بابری مسجد کے توڑنے کو جائز قرار دے رہے ہیں۔ کیوں کہ اگر طالبان کو اپنے ملک میں غیر مسلم یادگاروں کو مٹانے کا حق ہے تو انڈیا کے کٹر لوگ یہ کہیں گے کہ پھر ہمیں بھی اسی طرح اپنے ملک میں مسلم یادگاروں کو مٹانے کا حق ہے۔

۱۳ مسٹر کاظمی نے ایران ریڈیو کے لئے ۸ مارچ ۲۰۰۱ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر افغانستان میں بدھا کے مجسموں کو توڑنے سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ افغانستان میں بدھا کے مجسموں کے توڑنے کو بابری کا مسجد کا رد عمل بتانا سخت ناعاقبت اندیشانہ فعل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بالواسطہ انداز میں اس کو درست قرار دے رہے ہیں کہ ہر ملک دوسری قوم کی تاریخی یادگار کو توڑے۔

۱۴ ہندی روزنامہ راشٹریہ سہارا (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر اپادھیائے نے ۸ مارچ ۲۰۰۱ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر بدھا کے مجسموں کو توڑنے سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اسلام کی تعلیم کے مطابق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم پہلے فلاں کام کی مذمت کرو، اس کے بعد ہم افغانستان میں بتوں کو توڑنے کی مذمت کریں گے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ کسی شرط کے بغیر برائی کی مذمت کی جائے۔

۱۵ بی بی سی لندن (اردو سروس) کی نمائندہ ایلیا حیدر نے ۹ مارچ ۲۰۰۱ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر افغانستان میں بت شکنی یا مجسمہ شکنی سے تھا۔ جو طالبان کے لیڈر ملا عمر کے حکم سے ہو رہا ہے۔ بتایا گیا کہ طالبان حکومت کا یہ فعل اسلامی تعلیم کے بالکل خلاف ہے۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ خلیفہ ثانی عمر فاروق کے زمانہ میں مختلف ممالک فتح ہوئے مگر ان ملکوں میں بت شکنی کی مہم نہیں چلائی گئی۔ اب سوال یہ ہے کہ خلیفہ عمر کا طریقہ مسلمانوں کے لئے نمونہ ہے یا ملا عمر کا طریقہ۔

۱۶ روہیل کھنڈ یونیورسٹی (بریلی) میں سالانہ لکچر کا نظام ہے۔ اس کے تحت صدر اسلامی مرکز کو دعوت دی گئی۔ ۱۴ مارچ ۲۰۰۱ کو یونیورسٹی میں ان کا لکچر ہوا جس کا عنوان اسلام اینڈ پیس تھا۔ یہ سالانہ لکچر ڈپارٹمنٹ آف اینشنٹ ہسٹری اینڈ کلچر کے تحت منعقد کیا تھا۔ تقریر کے بعد سوال اور جواب کا پروگرام تھا۔ یونیورسٹی کے لوگوں نے نہایت دلچسپی کے ساتھ اس میں حصہ لیا۔ اسلام کے بارے میں ان کی بہت سی غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔

Books by Maulana Wahiduddin Khan

Islam Rediscovered	195.00
A Treasury of the Quran	75.00
The Quran for All Humanity	75.00
The Quran: An Abiding Wonder	145.00
The Call of the Qur'an	95.00
Muhammad: A Prophet for All Humanity	195.00
Words of the Prophet Muhammad	75.00
An Islamic Treasury of Virtues	195.00
Islam and Peace	150.00
Introducing Islam	195.00
The Moral Vision	145.00
Principles of Islam	145.00
Indian Muslims	65.00
God Arises	125.00
Islam: The Voice of Human Nature	40.00
Islam: Creator of the Modern Age	70.00
Woman Between Islam and Western Society	145.00
Woman in Islamic Shari'ah	125.00
Islam As It Is	70.00
Religion and Science	45.00
Tabligh Movement	40.00
Hijab in Islam	20.00
The Way to Find God	25.00
The Teachings of Islam	50.00
The Good Life	45.00
The Garden of Paradise	45.00
The Fire of Hell	45.00
Islam and the Modern Man	25.00
Uniform Civil Code	20.00
Man Know Thyself	20.00
Muhammad: The Ideal Character	20.00
Polygamy and Islam	20.00
Concerning Divorce	20.00

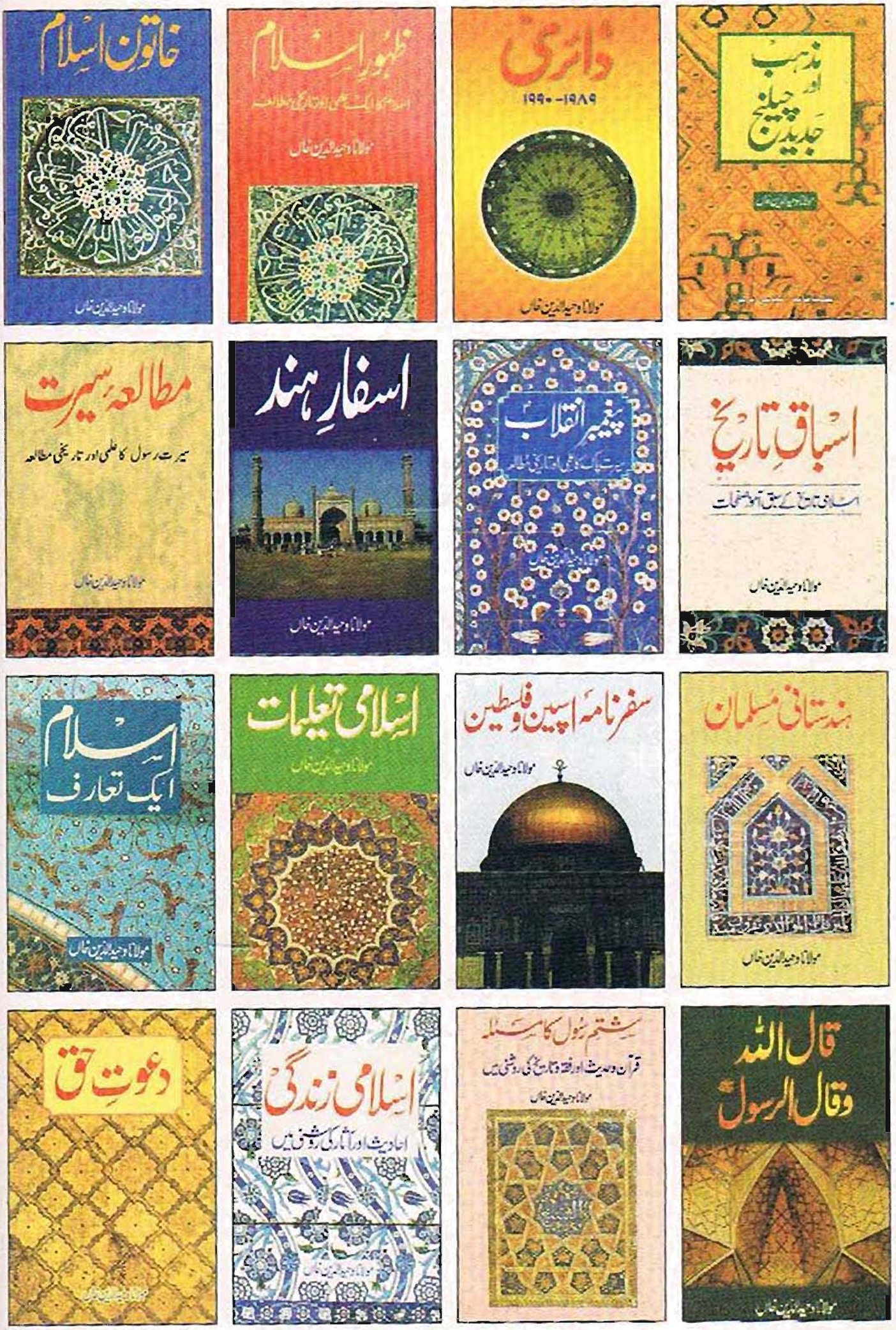

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4625454, 4626666 Fax: 4697333
E-mail: skhan@vsnl.com • Website: alrisala.org